الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

نادان نے کہا کہ ——————

میں نے اپنا ماضی اور حال دونوں برباد کر دیا

دانش مند بولا : مگر مستقبل تو برباد نہیں ہوا

اکتوبر ۱۹۸۹

شمارہ ۱۵۵

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ

جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۵ اکتوبر ۱۹۸۹

	صفحہ		صفحہ
یقینی کامیابی	۲	دینِ فطرت	۱۹
کچھ نہیں	۳	قدرت کا فیصلہ	۲۳
اسلامی شجاعت	۴	حقیقت پسندی	۲۵
پہلے اور بعد	۶	اطلاع کے بغیر	۲۷
دو کردار	۷	دونوں یکساں	۲۸
وقفۂ تعمیر	۸	بے خبری	۲۹
حسنِ تدبیر	۹	۶ اپریل	۳۰
بلند فکری	۱۰	فخر یا شکر	۳۱
اخلاقی حالت	۱۱	السلام علیکم	۳۲
سوچ کا فرق	۱۲	بد دعا نہیں	۳۳
طاقت کا خزانہ	۱۳	نکاح و طلاق	۳۵
علم کی اہمیت	۱۴	حاضر جوابی	۳۶
مشینی امداد	۱۵	محسن کشی کیوں	۳۷
نئے دور کے کنارہ	۱۶	صبر کی اہمیت	۳۹

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 697333, 611128

یقینی کامیابی

ایک بُت پرست دکاندار کو میں نے دیکھا کہ وہ روزانہ صبح کو پتھر کی بنی ہوئی مورتی کو پوجتا ہے، اور اس کے بعد بازار جاکر اپنی دکان کھولتا ہے۔ وہ اپنی دکان داری میں کافی کامیاب تھا۔

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ یہ ہمارے دیوتا ہیں۔ جب ہم ان کی پوجا کر لیتے ہیں تو ہم کو پورا وشواش ہو جاتا ہے کہ اب ہم ان کی مدد سے ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ دیوتا ہمارے لیے سرچشمۂ اعتماد (Source of confidence) ہیں۔

کامیابی کا سب سے بڑا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ اعتماد ہے۔ ایک شخص اگر فرضی اور بے حقیقت دیوتاؤں کی بنیاد پر بھی اپنے اندر اعتماد کا جذبہ پیدا کر لے تو وہ بھی اس دنیا میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو سچے خدا پر یقین ہو اور اس کی بنیاد پر اس کے اندر اعتماد کی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ اپنے منصوبوں میں کتنا زیادہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ مَن صَلّی الصبح فھو فی ذمۃ اللّٰہ یعنی جس شخص نے صبح کی نماز ادا کرلی وہ اللہ کی ذمہ داری (Guarantee) میں آگیا۔ گویا صبح (فجر) کی نماز پورے دن کے لیے آدمی کو مالک کائنات کی سرپرستی اور نگرانی میں دیدیتی ہے۔ اس کے بعد یہ خدا کا ذمہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہر خطرہ کے موقع پر آدمی کی حفاظت کرے، وہ ہر ممکن مدد کے ذریعہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔

آدمی رات کے وقت آرام کرتا ہے۔ اس کے بعد صبح ہوتی ہے تو وہ تیار ہو کر اپنے کام کے لیے گھر سے باہر جاتا ہے۔ اب اگر آدمی اپنے اندر خدائے واحد کا یقین پیدا کر لے اور رات گزار کر صبح کو اٹھے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے باہر نکلے تو وہ پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوگا۔ اس کا دل اس سے کہے گا کہ کامیابی تمہارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ اب تمہارے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

جو آدمی اس اعتماد کے ساتھ زندگی کے کاروبار میں داخل ہو وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ محنت کرے گا۔ وہ دشوار گزار راستہ میں بھی اس یقین کے ساتھ گھستا چلا جائے گا کہ اس کے دوسری طرف یقینی کامیابی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ایسے آدمی کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

کچھ نہیں

سولہواں لوئی (Louis XVI) فرانس کا آخری بادشاہ تھا۔ وہ ۱۷۵۴ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۹۳ میں اس کی وفات ہوئی۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں فرانس کا جمہوری انقلاب (۱۷۸۹) آیا۔ اس انقلاب کی کامیابی کے بعد اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابتداءً وہ قید میں رہا۔ اس کے بعد ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ کو اسے اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ وہ انقلاب فرانس کے خلاف بیرونی طاقتوں سے سازباز کر رہا تھا تاکہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر سکے۔

فرانس کے اس آخری بادشاہ لوئی کے بارہ میں ایک مورخ لکھتا ہے کہ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ روزانہ اپنی ڈائری تحریر کرے۔ اس ڈائری میں ہر روز وہ کسی تقرر، کسی واقعہ، کسی ملاقات کا مختصر اندراج کرتا تھا۔ ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ کو اس نے بہت زیادہ وقت شکار میں گزارا تھا۔ رات کے وقت اس نے اس تاریخ کو اپنی ڈائری میں شکستہ انداز صرف ایک لفظ لکھ دیا کچھ نہیں :

It was the habit of King Louis XVI of France to keep a daily diary. In it he would make a brief entry every day about an appointment, an event, or a meeting. On July 14, 1789, he had spent long hours hunting. At night he scribbled one short word against that date: "Nothing".

فرانس کے بادشاہ کی ڈائری کا ۱۴ جولائی کا صفحہ ہر آدمی کی زندگی کا آخری صفحہ ہے۔ یہ صرف ایک ناکام بادشاہ کی کہانی نہیں، بلکہ یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔

ہر آدمی اپنے آپ کو کسی سرگرمی میں مصروف کیے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کچھ کر رہا ہوں۔ میں اپنے آخری دن کے لیے کچھ حاصل کر رہا ہوں۔ مگر جب دن ختم ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا آخری لمحہ آتا ہے تو وہ حیرانی کے ساتھ دیکھتا ہے کہ اس نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس کی زندگی کی کتاب کے آخری صفحہ پر کچھ نہیں (Nothing) لکھا ہوا ہے۔

کیسا عجیب ہے وہ عمل جو بے عملی ہو۔ کیسی عجیب ہیں وہ سرگرمیاں جو آخر میں صرف "کچھ نہیں" بن کر رہ جائیں۔

اسلامی شجاعت

حطین کی جنگ (۱۱۸۷) تاریخ کی مشہور جنگ ہے۔ حطین شمالی فلسطین کا ایک مقام ہے۔ صلاح الدین ایوبی نے اسی مقام پر اپنی غیر معمولی جنگی منصوبہ بندی کے ذریعہ صلیبی فوجوں پر فتح حاصل کی۔ اس وقت مسلم فوج کی تعداد ۱۸ ہزار تھی، اور عیسائی فوج کی تعداد ۱۵ ہزار۔ جنگ میں بیشتر عیسائی فوجی مارے گیے۔

جنگ کے بعد بہت سے عیسائی سردار گرفتار ہوئے۔ ان میں یروشلم کا بادشاہ (Guy de Lusignan) اور فرانسیسی جنرل ریجینالڈ (Reginald) بھی شامل تھا۔ ریجینالڈ کے متعلق مورخین متفق ہیں کہ اس نے صلاح الدین ایوبی کے ساتھ بار بار غدر کا معاملہ کیا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ ۱۱۴۷ء اور ۱۱۸۷ء کے درمیان ہونے والی صلیبی لڑائیوں میں اہم فوجی شخصیتوں میں سے ایک تھا جس کی صلح کی مدت کے دوران مسلم قافلوں پر ناعاقبت اندیشانہ حملوں کی پالیسی آخر کار یروشلم کی لاتینی بادشاہت کی بربادی اور اس کے بیشتر علاقوں کے کھوئے جانے کا سبب بنی:

> One of the leading military figures of the Crusades between 1147 and 1187, whose reckless policy in raiding Muslim caravans during periods of truce led to the virtual destruction of the Latin Kingdom of Jerusalem and the loss of most of its territory (VIII/480).

مورخ ابن شداد نے لکھا ہے کہ ریجینالڈ نے ایک بار مسلم قافلہ پر دھوکے سے حملہ کیا۔ انھوں نے اس کو خدا کا واسطہ دلایا۔ اور اس معاہدہ صلح کا واسطہ دیا جو اس کے اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ مگر ریجینالڈ نے کہا کہ اپنے محمد سے کہو، وہ تمہیں بچائے۔ یہ خبر جب صلاح الدین ایوبی تک پہونچی تو اس نے نذر مانی کہ اللہ جب اس کے اوپر مجھے فتح دے گا تو میں خود اس کو قتل کروں گا (انه لما غدر بالقافلة ناشدوا الله والصلح الذی بینه وبین المسلمین۔ فقال: قولوا لمحمد کم یخلصکم۔ فلما بلغه ذلك عنه نذر انه متی اظفره الله به قتله بنفسه، صفحہ ۱۲۷)

جنگ کے بعد ریجینالڈ اور دوسرے لوگ قیدی کی صورت میں صلاح الدین ایوبی کے سامنے لائے گئے۔ صلاح الدین نے ریجینالڈ کی غداری کے واقعات اس کو یاد دلائے۔ نیز اس واقعہ کو یاد دلایا جب کہ اس نے حاجیوں کے ایک قافلہ کو لوٹا تھا۔ اور ان کی فریاد پر ان سے کہا تھا کہ اپنے محمد کو بلاؤ، وہ تم کو بچائیں گے۔ اس کے بعد صلاح الدین نے تلوار اپنے میان سے نکالی اور ریجینالڈ کی گردن ماردی۔ اس کو قتل کرتے ہوئے صلاح الدین نے کہا کہ لو یہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارا انتقام لیتا ہوں (ها انا ذا انتصر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم)

یروشلم کے بادشاہ گائی نے جب ریجینالڈ کا یہ انجام دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ وہ ڈرا کہ اب میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ تلوار کا دوسرا وار اس کے اوپر پڑنے والا ہے۔ مگر سلطان صلاح الدین نے اس کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا:

ليس من عادة الملوك ان يقتلوا الملوك واما هذا فانه نقض العهد مرة بعد مرة فجرى ما جرى (النوادر السلطانیہ، ۶۴)	یہ بادشاہوں کی عادت نہیں کہ وہ بادشاہوں کو قتل کریں۔ باقی اس شخص (ریجینالڈ) نے تو عہد کو بار بار توڑا تھا۔ پس ہوا جو کچھ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس شخص کو قتل کر دیا جس نے بار بار کے غدر اور معاہدہ کی خلاف ورزی سے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ ناقابل معافی حد تک ایک برا آدمی ہے۔ مگر صلاح الدین نے اس شخص کو چھوڑ دیا جو اگرچہ دشمن تھا۔ مگر اس نے خبث اور کمینگی اور نقض عہد کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اسی کا نام اسلامی شجاعت ہے۔ سچا اسلامی بہادر وہ ہے جو لڑنے کے ساتھ صلح بھی کرنا جانتا ہو۔ جو انتقام لینے کے ساتھ معاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ جو یہ جانتا ہو کہ کب تلوار اٹھائی جاتی ہے اور کب یہ ضروری ہوتا ہے کہ تلوار کو میان میں ڈال لیا جائے۔

اسلام دورجدید کا خالق
صفحات ۱۱۲
ہدیہ ۱۵ روپیہ

پہلے اور بعد

عرب اسلام سے پہلے کیا تھے اور اسلام کے بعد کیا ہو گئے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے تراش کر بُت بنائے تھے جن کا نام انھوں نے لات اور منات اور عزّیٰ رکھا تھا۔ اور پھر پتھر کے ان خود ساختہ بتوں پر فخر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے:

اللاتَ والعزّیٰ ومناةَ الثالثةَ الاخریٰ، تلك الغرانيقُ العُلیٰ وان شفاعتهن لترتجیٰ

یہ ان کا وہ حال تھا جو اسلام کا فکر ملنے سے پہلے تھا۔ جب انھیں اسلام ملا اور ان کی سوچ بدل گئی تو ان کا حال یہ ہوا کہ ۱۴ھ میں ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ قادسیہ میں ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے۔ رستم اس وقت پورے جاہ و جلال کے ساتھ زریں تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ربعی بن عامر کو ایک شاندار کرسی بیٹھنے کے لیے پیش کی۔ مگر وہ اس کو چھوڑ کر زمین پر بیٹھ گئے۔ رستم نے پوچھا کہ تم اس کرسی پر کیوں نہیں بیٹھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس قسم کی مزین نشستوں پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے (انّا لا نستحبُّ القعودَ علیٰ زینتکم هٰذه) اس کے بعد رستم نے پوچھا کہ تم اپنے ملک سے نکل کر یہاں ہمارے ملک میں کس لیے آئے ہو، ربعی بن عامر نے جواب دیا:

الله ابتعثنا لنُخرجَ من شاء من عبادة العباد الیٰ عبادة الله ومن ضيق الدنيا الیٰ سَعَتِها ومن جور الاديان الیٰ عدل الاسلام فارسلنا بدينه الیٰ خلقه لندعوهم اليه (حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۲۲۰)

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ جو چاہے اس کو ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف لائیں۔ اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف۔ پس اللہ نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی خلق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔

جو لوگ بتوں پر فخر کرتے تھے، انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑ دیا۔ جو لوگ انسانوں کے آگے جھکتے تھے، وہ انسانوں کو خدا کے آگے جھکانے والے بن گئے۔ پہلے اگر وہ حیوانی سطح پر تھے تو اسلام نے انھیں انسانی سطح پر پہونچا دیا۔

دو کردار

بنو عباس نے بنو امیہ سے اقتدار چھینا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اموی خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کرنا شروع کیا تاکہ کوئی تخت کا دعویدار باقی نہ رہے۔ تاہم ان کا ایک نوجوان (عبدالرحمٰن الداخل) ان کی پکڑ سے بچ گیا۔ وہ دمشق سے بھاگ کر اسپین پہونچا۔ وہاں اس نے بنو امیہ کی مشہور سلطنت قائم کی۔

بنو عباس کا دارالسلطنت بغداد تھا اور اسپین کی اموی حکومت کا دارالسلطنت قرطبہ۔ مذکورہ تاریخی پس منظر کی وجہ سے دونوں میں مسلسل رقابت رہتی تھی۔ فرانس اس سمندر پار اموی سلطنت کا پڑوسی تھا۔ بغداد نے یہ کیا کہ اس نے فرانس کے عیسائی حکمراں کی خدمت میں قیمتی تحفے روانہ کیے اور اس کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اسپین کی اموی حکومت کے خلاف کارروائی کرکے بغداد کے انتقامی جذبات کی تسکین کرے۔

دوسری طرف بغداد کی عباسی سلطنت کا پڑوسی قسطنطنیہ تھا۔ سابق رومی شہنشاہیت کا وارث قیصر اپنی سلطنت کا بڑا حصہ کھوکر اس وقت قسطنطنیہ میں اپنا مرکز قائم کیے ہوئے تھا۔ قیصر نے سوچا کہ بغداد جس طرح اسپین پر حملہ کرنے کے لیے فرانس کے عیسائی حکمراں کی مدد کر رہا ہے، اسی طرح اگر میں بغداد کے خلاف مہم شروع کروں تو قرطبہ کی طرف سے مجھے مدد حاصل ہوگی۔

اس امید کے تحت قیصر قسطنطنیہ نے ۲۰۹ھ میں اپنا ایک سفیر قرطبہ کے اموی حکمراں عبدالرحمٰن الثانی کے پاس بھیجا۔ بظاہر عبدالرحمٰن الثانی کو قیصر کے سفیر کا زبردست خیر مقدم کرنا چاہیے تھا۔ کیوں کہ وہ اس کے دشمن کے خلاف چڑھائی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس طرح وہ بغداد کے خلاف اپنے انتقامی جذبات کی تسکین حاصل کرسکتا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ قیصر کے سفیر نے عبدالرحمٰن الثانی سے کہا کہ اگر آپ قیصر سے دوستی کریں تو اس کے تعاون سے آپ اپنی آبائی سلطنت (شام، عراق، عرب، وغیرہ) عباسیوں سے واپس لے سکتے ہیں۔ مگر عبدالرحمٰن الثانی نے قسطنطنیہ کے سفیر کو رسمی باتیں کرکے لوٹا دیا۔

انتقامی جذبات کی تسکین کے لیے دشمن کے دشمن کو دوست بنانا ایک سطحی فعل ہے۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو اس قسم کے جذبات سے اوپر اٹھ جائے۔ جو اصول کی بنا پر لوگوں سے معاملہ کرے نہ کہ دوستی اور دشمنی کی بنا پر۔

وقفۂ تعمیر

کائنات خدا کی خاموش کتاب ہے۔ وہ ربانی حقیقتوں کو تمثیل کے روپ میں بیان کرتی ہے۔ آدمی اگر کائنات کی خاموش زبان کو سن سکے تو وہ اس کے لیے معرفت کا عظیم ترین کتب خانہ بن جائے۔

درخت کو دیکھئے۔ درخت زمین سے نکلتا ہے تو وہ کمزور پودے کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے تنہ میں ابھی طوفان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس وقت درخت کیا کرتا ہے۔ وہ سراپا نرمی بن جاتا ہے۔ ہواؤں کے جھونکے آتے ہیں تو وہ ان کے مقابلہ میں اکڑتا نہیں، بلکہ ہوا کا جھونکا اس کو جس طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ اسی طرف چلا جاتا ہے۔ وہ، حالی کی زبان میں، "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کی تصویر بن جاتا ہے۔

مگر اسی پودے کو ۲۵ سال بعد دیکھئے تو وہ بالکل دوسری تصویر پیش کر رہا ہوگا۔ اب وہ اپنے موٹے تنہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اب جھکنے کا لفظ اس کی ڈکشنری سے خارج ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ ہواؤں کے جھونکے سے غیر متاثر رہ کر سیدھا اپنی جڑوں پر کھڑا رہتا ہے۔ اب وہ زمین پر "درخت" بن کر رہتا ہے، جب کہ اس سے پہلے وہ "پودا" بن کر رہ رہا تھا۔

درخت اس طرح تمثیل کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ہر آدمی پر ابتداءً وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کو ایک وقفۂ تعمیر درکار ہوتا ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی جڑیں زمین میں داخل کرے۔ وہ اپنے تنہ کو مضبوط کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایک طاقت ور وجود کی حیثیت سے نشو ونما دے۔ اس وقفہ کے دوران اس کو اس طرح نہیں رہنا چاہیے جس طرح کوئی شخص مضبوط اور مستحکم ہونے کے بعد رہتا ہے۔

اس ابتدائی مرحلہ میں اس کو نرمی اور موافقت (Adjustment) کا مجسمہ بن جانا چاہیے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کو تعمیر کا وقفہ نہیں ملے گا، اور جو کوئی وقفۂ تعمیر سے محروم ہو جائے، وہ کبھی مرحلۂ تعمیر تک بھی نہیں پہنچے گا۔ ایسا شخص ہمیشہ کمزور پودا بنا رہے گا، وہ کبھی تناور درخت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

حسنِ تدبیر

جولائی ۱۹۸۹ کے آخری ہفتہ میں میں راجستھان میں تھا۔ وہاں میری ملاقات جناب مشتاق احمد صاحب (۵۶ سال) سے ہوئی۔ وہ شیو گنج (ضلع سروہی) کے رہنے والے ہیں۔ اور وہاں کے ایک پرانے تاجر ہیں۔ ان کی تجارتی زندگی نے ان کے اندر وہی اخلاقی صفت پیدا کر دی ہے جس کو "یک طرفہ حسن اخلاق" کہا جاتا ہے۔

انھوں نے ۱۹۸۸ کا ایک ذاتی واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ بے حد سبق آموز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے فساد کو ختم کرنے کے لیے شاہ کلید ہے، بشرطیکہ آدمی اس کی گہرائی کو سمجھے اور اس کو صبر و حکمت کے ساتھ استعمال کرے۔

انھوں نے بتایا کہ رمضان سے کچھ پہلے شیو گنج میں ان کی مسجد کی دیوار پر کسی ہندو نوجوان نے ہندی زبان میں کچھ نعرے لکھ دیے۔ مثلاً "دیش کے لیے جینا سیکھو"۔ "ہندو جاگے گا، دیش جاگے گا"۔ اس طرح کے کچھ اور نعرے تھے جو بظاہر قابل اعتراض اور اشتعال انگیز تھے۔ مگر مشتاق احمد صاحب نہ اس پر غصہ ہوئے اور نہ اس کے خلاف کسی ردّ عمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے سادہ طور پر صرف یہ کیا کہ دیوار کے اس حصہ کو پانی سے دھو دیا جہاں نعرے لکھے ہوئے تھے۔

رمضان سے پہلے ہر سال ان کی مسجد میں سفیدی ہوتی ہے۔ چنانچہ شعبان کا مہینہ آیا تو مسجد کی دیواروں پر سفیدی کر دی گئی۔ اس طرح نعروں کا نشان مکمل طور پر غائب ہو گیا۔ جہاں پہلے کالی سیاہی سے نعرے لکھے ہوئے تھے، وہاں سفید چمکتی ہوئی دیوار نظر آنے لگی۔

میں نے یہ واقعہ سنا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ یہی اسلام ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف قومی سرکشی ہے، اس کا اسلام سے یا رسول اللہ کی سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر برائی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی شرط صرف ایک ہے ——— آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی سیاہی پر اپنی طرف سے سفیدی پھیر دے۔ وہ سنتِ رسول کے مطابق سیئہ کو حسنہ کے ذریعہ مٹا دے۔

بلند فکری

ٹوکیو کے ایک اشاعتی ادارہ نے ۱۶۰ صفحات کی ایک کتاب چھاپی ہے۔ یہ جاپانی سماج اور جاپانی انسان کے مزاج کا تعارف ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Chie Nàkane, *Japanese Society* (1987)

اس کتاب کی مصنف ایک خاتون چی ناکین ہیں جو ٹوکیو یونیورسٹی میں سوشل اینتھراپالوجی کی پروفیسر ہیں۔ انھوں نے تفصیلی معلومات دے کر بتایا ہے کہ جاپانیوں کا ذہن (Mental make-up) کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، جاپانی انسان کی ذہنی ساخت کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ——— اس بات کی مسلسل خواہش کہ وہ اوسط سے اوپر اٹھ سکے:

The constant desire to rise a little higher than the average (p. 155).

صاحب کتاب کے نزدیک یہی جاپانیوں کا طریق زندگی ہے۔ وہ اس کو مذہبی تعلیم کی طرح مقدس مان کر ہمیشہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

زندگی میں ٹھہراؤ نہیں۔ آدمی یا تو نیچے گرے گا یا اوپر اٹھے گا۔ یہ اصول اتنا قطعی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اوپر نہ اٹھائیں تو آپ خود بخود نیچے جانا شروع کر دیں گے۔ نیچے گرنے کے لیے کسی مزید کوشش کی ضرورت نہیں۔

یہ اصول دین اور دنیا دونوں معاملہ میں یکساں طور پر درست ہے۔ حقیقی مومن وہ ہے جس کا ایمان مسلسل بڑھ رہا ہو۔ جس آدمی کے ایمان میں اضافہ کا عمل رک جائے، وہ ایمانی تنزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دے گا۔ یہاں کسی ایک حالت میں ٹھہراؤ ممکن نہیں۔

یہی معاملہ دنیا کا ہے۔ دنیا کے معاملات میں بھی آدمی کو مسلسل ترقی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ جو شخص ترقی کی طرف اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے وہ اولاً جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے ختم ہو جائے گا ——— ہمیشہ اپنے ارتقاء کے لیے فکرمند رہیے۔ ارتقاء کے لیے فکرمند نہ ہونا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے۔

اخلاقی حالت

ٹائم (۵ ستمبر ۱۹۸۸) میں ایک مضمون چھپا۔ اس معلوماتی مضمون کا موضوع کوریا کی اقتصادیات (Korean economy) تھا۔ اس مضمون میں کہا گیا تھا کہ کوریا کی کار ہیونڈائی (Hyundai) کا انجن جاپان کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ بقیہ اجزاء کو اپنے یہاں تیار کرکے اس کو وہ کوریا کی کار کے طور پر فروخت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہیونڈائی موٹر کمپنی (سیول) کے جنرل منیجر ڈونگ مان کم (Dong Man Kim) نے ٹائم کو ایک تردیدی خط لکھا جس میں کہا گیا تھا:

I would like to invite you to our Ulsan plant to see how we manufacture our own engines.

یعنی ہم آپ کو اپنے کارخانہ واقع اُلسان میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ وہاں آکر دیکھیں کہ ہم کس طرح اپنے انجن خود تیار کرتے ہیں۔ جنرل منیجر کا یہ خط نہ صرف ایک چیلنج تھا بلکہ وہ ٹائم کی رپورٹ کو خلافِ واقعہ قرار دے رہا تھا۔ اس کے باوجود ٹائم نے اس کو اپنے شمارہ ۲۴ اکتوبر میں من وعن شائع کیا۔

یہ موجودہ دنیا کے "بے دینوں" کا حال ہے۔ دوسری طرف دین داروں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک شخص کے بارہ میں سراسر خلافِ واقعہ بات چھاپیں گے۔ اور جب اس کی تردید کی جائے گی تو وہ ہرگز تردید کو شائع نہ کریں گے۔ وہ غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے شخص مذکور پر جھوٹے الزامات لگانا شروع کردیں گے۔ ایک غلطی کا اعتراف نہ کرنے کے لیے مزید شدید تر غلطیاں کرتے چلے جائیں گے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، خاص طور پر نام نہاد دین دار طبقہ کے بارہ میں مجھے اس طرح کے تجربات کثرت سے ہوئے ہیں۔ حتی کہ میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کم از کم اخلاق و کردار کے اعتبار سے بدنام بے دین معروف دین داروں سے زیادہ دیندار ہیں۔

کسی قوم کی اصل طاقت اس کا اخلاق ہے۔ قوم کے افراد اخلاق و کردار کے جس رویہ پر ہوں گے، اسی درجہ کی کامیابی اسے حاصل ہوگی۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ اس میں ایک قوم یا دوسری قوم کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ اصول مسلمانوں پر بھی اتنا ہی چسپاں ہوتا ہے جتنا غیر مسلمانوں پر۔ یہ ایسا آفاقی اصول ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔

سوچ کا فرق

فریڈرک لینگ برج (Frederick Langbridge) انگریزی کا ایک شاعر ہے۔ وہ ۱۸۴۹ میں پیدا ہوا، ۱۹۲۳ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے کہ رات کے وقت دو آدمی جنگلہ کے باہر دیکھتے ہیں۔ ایک شخص کیچڑ دیکھتا ہے اور دوسرا شخص ستارہ :

Two men look out through the same bars
One sees the mud, and one the stars.

یہی بات ایک فارسی شاعر نے زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو فرق ہے وہ سننے کا فرق ہے۔ ایک آواز آتی ہے۔ تم اس کو دروازہ بند کرنے کی آواز سمجھتے ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ دروازہ کھلنے کی آواز ہے :

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو غلق باب و منم فتح باب می شنوم

درخت میں کانٹے کے ساتھ پھول بھی ہوتا ہے۔ یہی حال انسانی سماج کا ہے۔ سماجی حالات بظاہر خواہ کتنے غیر موافق ہوں، ہمیشہ اس کے اندر موافق پہلو بھی ساتھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ ایک شخص جو چیزوں کو صرف ظاہری طور پر دیکھنے کی نگاہ رکھتا ہو، وہ سطحی چیزوں کو دیکھے گا، اور زیادہ گہرے پہلوؤں کو دیکھنے میں ناکام رہے گا۔ مگر جو شخص گہری نظر رکھتا ہو وہ زیادہ دور تک دیکھے گا اور ناموافق پہلو کے ساتھ موافق پہلو کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس دنیا میں کیچڑ بھی ہے اور یہاں ستارے بھی ہیں۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ کون شخص کس چیز کو دیکھتا ہے اور کون شخص کس چیز کو۔ ایک ہی آواز ہے، مگر نادان آدمی اس کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ دروازہ بند ہو گیا۔ اور دانش مند آدمی سمجھتا ہے کہ دروازہ اس کے لیے کھول دیا گیا ہے۔

تمام مسائل ہمیشہ ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور ذہن کے اندر ہی ان کو ختم کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ آدمی کے اندر صحیح سوچ کا مادہ پیدا ہو جائے۔

طاقت کا خزانہ

انسانی دماغ ایک ناقابل یقین نظام ہے۔ اس کی جسامت ایک سنگترہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ مگر وہ ایک سکنڈ میں ۸۰۰ یادداشتیں ریکارڈ کر لیتا ہے۔ وہ اوسطاً ۷۵ سال تک برابر یہ کام جاری رکھ سکتا ہے۔

انسانی دماغ میں جو بات بھی پڑتی ہے، وہ پوری طرح اس کو محفوظ کر لیتا ہے، اور پھر کبھی اس کے کسی جزء کو فراموش نہیں کرتا۔ خواہ ہم ان تمام معلومات کو شعوری طور پر یاد میں نہ لا سکیں۔ تاہم ہمارے دماغ کے مستقل فائل میں ہر چیز ہر وقت موجود رہتی ہے۔

اگر ایک ایسا کمپوٹر بنایا جائے جس کے امکانات انسانی دماغ کے برابر ہوں تو اس کا انفراسٹکچر اتنا زیادہ ہوگا کہ وہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارت کو گھیر لے گا۔ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ نیویارک میں ہے اس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں اور اس کی اونچائی ۱۲۵۰ فٹ ہے۔ ایسا سپر کمپوٹر اگر بنایا جا سکے تو اس کو چلانے کے لیے ایک ارب واٹ بجلی کی توانائی درکار ہوگی۔ اس کی لاگت اتنی زیادہ ہوگی جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے :

The brain is a fabulous mechanism. About the size of half a grapefruit, it can record 800 memories a second for the average 75 years many of us live, without exhausting itself. The human brain retains everything it takes in and never forgets anything. Even though we don't recall all the information received, everything is on permanent file in our brain. If a computer to match the brain's potential was built, it would occupy space comparable to the size of the Empire State Building (1,250 feet tall) and need 1,000,000,000 watts of electrical power to run. The cost would be equally immense. The mind is one of God's most amazing gifts to man. Yet most people use only a small fraction of their mental ability. For many, the power remains largely untapped.

The Plain Truth, October 1988, p. 29.

یہ دماغ انسان کے لیے اللہ کا ایک انتہائی حیرت ناک تحفہ ہے۔ تاہم بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس کو صرف جزئی طور پر استعمال کر پاتا ہے۔

دماغ کی شکل میں دنیا کی سب سے طاقتور خدائی مشین آپ کے پاس موجود ہے۔ اس کو استعمال کیجیے، اور پھر کبھی آپ کو ناکامیابی کی شکایت نہ ہوگی۔

علم کی اہمیّت

جیفرسن (Thomas Jefferson) امریکہ کا تیسرا صدر تھا۔ وہ ۱۷۴۳ میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۱۸۰۱ سے لے کر ۱۸۰۹ تک امریکہ کا صدر رہا۔ جیفرسن نہایت قابل آدمی تھا۔ وہ انگریزی، لاتینی، یونانی، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی اور اینگلو سیکسن زبانیں جانتا تھا۔ مورخین اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی غیر معمولی قسم کا صاحب علم آدمی تھا:

He was an extraordinary learned man (10/130).

اس نے اپنی طویل عمر میں فلسفہ اور سائنس سے لے کر مذہب تک تقریباً تمام علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ آخر عمر میں اس نے یہ کوشش کی کہ وہ انجیل کا تجزیہ کرے اور یہ معلوم کرے کہ حضرت مسیح نے واقعۃً کیا کہا تھا اور بیان کرنے والوں نے ان کے بارے میں کیا بیان کیا:

He attempted an analysis of the New Testament in order to discover what Jesus really said as distinguished from what he was reported to have said.

جیفرسن نے آخر عمر میں یہ وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا جائے اس میں یہ نہ لکھا جائے کہ وہ امریکہ کا صدر تھا۔ بلکہ یہ لکھا جائے کہ وہ ورجینیا یونیورسٹی کا بانی تھا۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق اس کی قبر (Monticello) پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس میں یہ الفاظ درج ہیں:

Here was buried Thomas Jefferson ..... father of the University of Verginia (10/131).

حقیقت یہ ہے کہ علم سب سے بڑی دولت ہے۔ جو لوگ علم کی اہمیت کو جان لیں، ان کو امریکہ کی صدارت بھی ہیچ معلوم ہوگی۔

علم سب سے بڑی دولت ہے۔ علم ہی وہ واحد چیز ہے جس سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا، جس کی حد کبھی کسی کے لیے نہیں آتی۔ علم ہر معاملہ میں کارآمد ہے۔ وہ ہر میدان میں کامیابی کا زینہ ہے۔ علم سے آدمی کو وہ شعور ملتا ہے جس سے وہ دنیا کو جانے۔ جس سے وہ باتوں کو ان کی گہرائی تک سمجھ سکے۔ علم ایسا سکہ ہے جس سے آپ دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں۔

مشینی امداد

امریکی سماج میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بڑھاپے کی عمر میں پہونچ گیے ہیں مگر ان کا کوئی عزیز نہیں جو ان کے پاس رہے۔ وہ اپنے گھروں میں بالکل تنہا زندگی گذارتے ہیں۔ اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی اچانک ایسے حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے جس میں اسے فوری طور پر کسی مددگار کی ضرورت ہو، مگر اس کے پاس کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ اس قسم کے بوڑھوں کے لیے امریکہ کی پولیس نے ایک نظام جاری کیا ہے جس کا نام ہے ـــــ ٹیلیفون ڈائلنگ کمپیوٹر سروس :

Telephone-dialing computer service

یہ نظام ان بوڑھے لوگوں کی خود بخود دیکھ بھال کرتا رہتا ہے جو کسی گھر میں تنہا زندگی گزار رہے ہوں۔ ایک کمپیوٹر مشینی نظام کے تحت ہر روز انھیں ٹیلیفون کرتا ہے اور کہتا ہے کہ گڈ مارننگ، کیا آپ ٹھیک ہیں :

Good Marning! Are you O.K.?

اگر گھر کی طرف سے جواب میں ہاں (Yes) سنائی دے تو کمپیوٹر سمجھ لیتا ہے کہ گھر کا آدمی خیریت سے ہے۔ اور اگر گھر کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے تو کمپیوٹر فوراً پولیس کو اطلاع دے دیتا ہے۔ یہ اطلاع اتنی مکمل ہوتی ہے کہ پولیس چند منٹ میں اس کے گھر پہونچ جاتی ہے اور اس کو ضروری مدد پہونچاتی ہے۔

اوساگ (Osage) کا ایک شخص کلائڈ لٹر (Cly de Lytter) جس کی عمر ۶۳ سال ہے، ایک روز کمپیوٹر نے ان کو ٹیلیفون کیا تو ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کمپیوٹر نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے کمپیوٹر کی مدد سے سکنڈوں کے اندر آدمی کے گھر کا پورا پتہ معلوم کر لیا اور فوراً ایک پولیس پارٹی وہاں پہونچ گئی۔ دروازہ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ صاحب خانہ جو ذیابیطس کے مریض تھے، وہ کوما کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھیں فوراً اسپتال پہونچا کر ان کے علاج کا انتظام کیا گیا۔ اسی طرح ایک بوڑھا آدمی اس وقت بچا لیا گیا جب کہ اس کے دونوں ہاتھ ایک کھڑکی میں پھنس گیے تھے اور وہ ٹیلیفون کرنے یا ٹیلیفون سننے سے معذور ہو گیا تھا۔

(ٹائم، یکم مئی ۱۹۸۹)

نئے دور کے کنارہ پر

امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ یہ ان لوگوں کے بارہ میں ہے جو بہت زیادہ دولت مند ہیں۔ اس میں ۳۰ بڑے بڑے دولت مندوں کے مفصل انٹرویو درج کیے گیے ہیں۔ یہ وہ امریکی سرمایہ دار ہیں جن کا سرمایہ ۱۹۸۷ کے اندازہ کے مطابق ۴۲۵ ملین ڈالر تھا۔ کتاب کا نام یہ ہے :

The Ultra Rich, by Vance Packard, Little, Brown; 358 pages.

ان سرمایہ داروں کے پاس ممکن مسرفانہ خرچ سے بھی زیادہ رقم ہے۔ ان کے پاس اتنے بڑے بڑے مکانات ہیں جن کے اندر ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے رن وے (Runway) تک موجود ہے۔ وغیرہ (ٹائم ۱۳ فروری ۱۹۸۹)

تاہم وہ اپنی دولت سے پریشان ہیں۔ ایک دولت مند نے کہا کہ میرا مکان مجھ کو ایک وسیع قسم کا سرسبز پنجرہ (Verdant cage) معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور دولت مند نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں اس کو کیا کروں :

I didn't know what the hell to do with it.

ان دولت مندوں کو اکتاہٹ کے علاوہ اور بھی مسائل درپیش ہیں۔ مثلاً ایک دولت مند نے کہا کہ اس کے بچے جلد ہی خود کروڑپتی (Millionaires) ہو جائیں گے۔ وہ اپنی ۳۴۰ ملین ڈالر کی دولت کا کوئی حصہ انھیں دینا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ زیادہ دینا ان کو خراب کر دے گا :

Giving more just spoils them.

مصنف وانس پیکارڈ جو خود اقتصادیات کا عالم ہے، اس نے تفصیلی جائزہ کے بعد اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تھوڑے سے افراد کے درمیان زیادہ دولت کا اجتماع بہت برا ہے۔ یہ سرمایہ داری کی اچھی صحت کے لیے خطرناک ہے۔ اس کے علاج کے لیے مصنف نے ایک تجویز پیش کی ہے ——— ایک خاص مقدار، مثلاً ۲۵ ملین ڈالر کے بعد، پوری دولت پر ٹیکس لگانا :

Taxing net worth above a certain level (Say, $ 25 million).

سرمایہ دارانہ نظام میں نفع پرٹیکس کا اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت جس شخص کے پاس دولت ایک بار آجائے وہ مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں دولت کے ارتکاز (Concentration of wealth) کی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ یہ خرابی موجودہ سرمایہ دارانہ ممالک میں آخری حد تک آچکی ہے۔

پوری دولت پر سال بہ سال ٹیکس لگانا ایک اسلامی تصور ہے۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو شریعت اسلامی میں زکوٰۃ کہا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں نے وہاں کے سنجیدہ لوگوں کو کسی نئے معاشی اصول کا متلاشی بنا دیا ہے۔ حتی کہ اب وہ زکوٰۃ کا نام لیے بغیر زکوٰۃ کے اصول کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔

آج وہ بہترین وقت آگیا ہے جب کہ مغربی ملکوں کے سامنے اسلام کے معاشی اصولوں کو پیش کیا جائے اور وہ اس کو موجودہ سرمایہ داری کا نعم البدل سمجھ کر اسے قبول کرلیں، اور اسی کے ساتھ پورے اسلام کو بھی۔

آج کی دنیا ایک نئے دور کے آغاز کے کنارے کھڑی ہے۔ یہ وہی دور ہے جس کا متعین نام "اسلامی نظام" ہے۔ تاہم دنیا کو اس طرف لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ صرف ایک ہے۔ اور وہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ انھوں نے غیر مسلم اقوام سے اپنے جھوٹے قومی مسائل کے لیے جھوٹی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ اس لڑائی سے انھیں کچھ بھی حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ دوسری طرف یہ عظیم نقصان ہے کہ ان کے ان قومی جھگڑوں کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ناقابل بیان تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ اس بنا پر وہ اسلام کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اگر مسلمان صرف اتنا کریں کہ وہ کچھ نہ کریں یعنی دوسری قوموں سے قومی اور مادی جھگڑے ختم کردیں تو اسلام خود اپنی طاقت سے پھیلنے لگے گا، بغیر اس کے کہ اس کو پھیلانے کی براہ راست جدوجہد کی گئی ہو۔

اقوالِ حکمت   صفحات ۲۰۰   ہدیہ ۱۵ روپیہ

اخلاقی مسئلہ

ٹائم میگزین امریکہ کا ایک بہت کثیر الاشاعت ہفت روزہ ہے، ۱۹۸۷ کے پورے سال میں اس کو اپنے قارئین کی طرف سے جو خطوط ملے ان کی تعداد ۴۶ ہزار تھی۔ ٹائم کے اسٹاف نے کمپوٹر کے ذریعہ ان رایوں کا خلاصہ تیار کیا جو ان خطوط میں ظاہر کی گئی تھیں (پلین ٹروتھ، نومبر، دسمبر ۱۹۸۸)

عام طور پر ان خطوط میں اخلاقی انحطاط (Moral Lapses) کی شکایت کی گئی تھی۔ مثلاً طاقت کا غلط استعمال، حرص اور منافقت وغیرہ۔ قارئین کی اکثریت امریکی سوسائٹی کے بارہ میں مایوس تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قارئین نے سمت کے فقدان پر اپنے غم کا اظہار کیا تھا:

Readers mourned a lack of direction

موجودہ زمانہ میں جو سیکولر سماج بنائے گیے ہیں، ان میں بعض مشینی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو ایسے تمام سماج سخت اخلاقی مسائل کا شکار ہیں۔ موجودہ سیکولر سماج مشینی بنیادوں پر کھڑا ہوا ہے، حالاں کہ زیادہ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ اس کو اخلاقی بنیاد پر کھڑا جائے۔

سیکولر سماج میں اخلاقیات (Ethics) کو فہرست سے خارج نہیں کیا گیا ہے۔ وہ اس کی فہرست میں شامل ہے۔ سیکولر اور غیر مذہبی لوگ بھی اخلاقی معیار کی بات کرتے ہیں۔ مگر ان کی اس قسم کی باتیں بالکل بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف "اخلاق" کی اصطلاح میں سوچتے ہیں نہ کہ "گناہ" کی اصطلاح میں۔ اور گناہ کے تصور کو الگ کر کے اخلاقی اپدیش میں اثر انگیزی کی طاقت نہیں۔

گناہ کے عقیدہ کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے اندر محاسبہ (Accountability) کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہ آدمی کو ڈراتا ہے کہ اگر اس نے اخلاقی معیار کو چھوڑا تو وہ خدا کے یہاں پکڑا جائے گا۔ اس طرح اخلاقی معیار کو ایک طاقت ور محرک مل جاتا ہے۔ اس کو ایک واضح سمت مل جاتی ہے جس کے رُخ پر وہ اپنی زندگی کا سفر جاری کر سکے۔ اس محرک سے خالی ہونے کی وجہ سے آج کا انسانی سماج بے سمت اور بے رُخ ہو رہا ہے۔ جو لوگ جدید دنیا کو یہ سمت سفر دے سکیں وہ بلاشبہ اس کے ساتھ سب سے بڑا احسان کریں گے۔

دین فطرت

ایک مسلمان جون پور سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹیکسی میں ایک ہندو بھائی بھی تھے۔ ابتدائی تعارف کے بعد انھوں نے کہا: آپ لوگ تو پہلے ہندو تھے، پھر آپ اپنے پرانے دھرم پر کیوں نہیں آجاتے۔ مسلمان نے کہا کہ اسلام نے ہم کو توحید دی ہے، آپ ہمیں کیا دیں گے۔ اگر آپ ہمیں مورتی پوجا دیں، تو اس کو تو آپ خود ہی چھوڑ رہے ہیں۔ اسلام نے ہمیں سماجی برابری دی ہے۔ اس کے بدلے آپ ہمیں کیا دیں گے۔ اگر آپ ہم کو ذات پات اور چھوا چھوت دیں، تو اس سے بھی آپ لوگ خود ہی برأت کر رہے ہیں۔ ہندو بھائی یہ باتیں سن کر خاموش ہو گیے۔

ایک مسلمان اپنے گھر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص وہاں آیا۔ اس نے کہا کہ میں گورکھپور کا ایک برہمن ہوں۔ میرے دل میں کئی سال سے ایک کھٹک ہے۔ میں نے بہت سے پنڈتوں اور پادریوں سے پوچھا۔ مگر مجھے اطمینان نہ ہو سکا۔ میں اس تلاش میں ہوں کہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ کیا ہے۔ مسلمان نے کہا کہ نجات کا راستہ ہے ـــــ خدا کو ایک ماننا، آخری رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کرنا، اور ان کے بتائے ہوئے راستہ کے مطابق آخرت کی فکر کرنا۔ برہمن نے کہا کہ میں اسلام کی ان تینوں ہی باتوں کو مانتا ہوں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ مسلمان نے کہا کہ چلیے، مسجد میں چل کر نماز پڑھ لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کیسے نماز پڑھوں گا، میں تو ہندو ہوں۔ مسلمان نے کہا کہ جب آپ اسلام کی ان تین بنیادی باتوں (توحید، رسالت، آخرت) کا اقرار کرتے ہیں تو آپ مسلم ہیں۔ وہ راضی ہو گیے اور وضو کر کے مسلمان کے ساتھ مغرب کی نماز میں شریک ہو گیے (ملی جمعیۃ، ۱۵ اپریل ۱۹۸۹)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کس قدر سادہ مذہب ہے۔ اسلام کی یہ سادگی ہی اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام اتنا زیادہ سادہ مذہب ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھ سکتا ہے اور دوسروں کے اوپر اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ وہ اتنا فطری مذہب

ہے کہ کوئی بھی شخص جو اس کو خالی الذہن ہو کر سنے، وہ فوراً اس کے دل کو اپیل کرے گا۔

اسلام کے پھیلنے میں رکاوٹ صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ اسلام کو سننے اور سمجھنے کے لیے معتدل فضا باقی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اگر اجنبیت حائل نہ ہو اور ان کے درمیان تناؤ کا ماحول ختم ہو جائے تو منظم تبلیغی کوششوں کے بغیر اپنے آپ تبلیغ ہونے لگے۔ دونوں فرقوں کے درمیان روزانہ کا عام میل جول ہی اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے۔

دوسرے مذاہب جو آج دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان میں عقائد اور عبادات کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ (پنڈت اور پادری) ہی اس کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام ایک انتہائی سادہ اور کامل طور پر ایک فطری مذہب ہے۔ اس لیے ہر مسلمان اس کی تبلیغ کر سکتا ہے، ہر مسلمان اس کی اشاعت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ہزاروں لوگ جو ہر روز دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام قبول کرتے رہتے ہیں، ان کا معاملہ زیادہ تر یہی ہے، وہ کسی تربیت یافتہ مبلّغ کی تبلیغ سے اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ بلکہ بیشتر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے میل جول کے درمیان انھیں اسلام کی کسی تعلیم کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس سے ان کے اندر تلاش کا جذبہ جاگتا ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن یا دوسری اسلامی کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مزید متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

روسنا توری (Rosanna Da La Torre) ایک امریکی خاتون ہیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ پہلے وہ ایک فیشن پسند لڑکی تھیں۔ مگر اب وہ اسلامی طریقہ کے مطابق باحجاب زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے قبول اسلام کے بارہ میں ان کا ایک خط امریکی مسلمانوں کے جریدہ اسلامک ہورائزن (Islamic Horizons) کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ میں شائع ہوا ہے۔

وہ لکھتی ہیں کہ میں کیلی فورنیا کی ایک کیتھولک خاندان میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین بچپن سے مجھ کو چرچ لے جاتے تھے۔ وہاں میں دیکھتی تھی کہ لوگ مسیح کے اسٹیچو کے آگے جھک رہے ہیں۔ مگر میرا دل کبھی اس پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اسٹیچو کے

اندر خدا ہے :

I did not associate deity to a statue.

اس بنا پر میرے اور میرے خاندان کے درمیان ایک کشمکش جاری رہتی تھی۔ تاہم میرا تلاش کا جذبہ ختم نہیں ہوا۔ میں نے مسیحیت اور دوسرے مذہبوں کا مطالعہ شروع کیا۔ مگر مجھے اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ اس وقت تک مجھے اسلام کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

ابوظبی (عرب امارات) کی ایک مسلم خاتون علاج کے لیے لاس انجلیز آئیں۔ اس دوران میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو انھوں نے دعوت دی کہ میں بھی ان کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے ابوظبی چلوں۔ اس طرح میں امریکہ سے ابوظبی پہونچی۔ وہاں ایک روز میرے کان میں ایک نئی آواز آئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ "اذان" ہے۔

مؤذن بلند آواز سے پکار رہا تھا : اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے (اللہ اکبر اللہ اکبر) اس نئی آواز نے خاتون کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ چرچ کے اندر انھوں نے دیکھا تھا کہ خدا ایک محدود اسٹیچو کے روپ میں رکھا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسیحی چرچ یہ کہہ رہا تھا کہ خدا چھوٹا ہے۔ یہاں یہ اعلان سنائی دیا کہ خدا بڑا ہے۔ امریکی خاتون کو چرچ کی بات غیر معقول اور خلاف واقعہ محسوس ہو رہی تھی، اس کے مقابلہ میں مسجد کی بات پوری طرح معقول اور مطابقِ واقعہ نظر آئی۔ چرچ کا پیغام انھیں متاثر نہ کر سکا تھا، مگر مسجد کا پیغام ان کی فطرت کی آواز بن کر ان کے سینے میں اتر گیا۔

اس تاثر کے تحت جب مؤذن نے پکارتے ہوئے کہا کہ آؤ فلاح کی طرف (حی علی الفلاح) تو امریکی خاتون کو ایسا محسوس ہوا جیسے خدا ان سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہو کہ روسنا، میری طرف آؤ، کیوں کہ میں ہی وہ سچائی ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اذان کا پیغام نہایت طاقت ور تھا، وہ بجلی کی کوند کی طرح میرے دل پر اثر کر گیا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ابتداءً میرے اندر اسلام سے دلچسپی پیدا کر دی :

The message of the Adhan was powerful. It hit my heart like a bolt of lightening. This is what sparked my interest in Islam (p. 4).

خاتون موصوف لکھتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے اسلامی کتابوں کو پڑھنا شروع کیا۔ اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اور قرآن کا مطالعہ کیا۔ الحمدللہ، اللہ نے مجھے اسلام کی نعمت بخشی۔ میری پیاس آخری طور پر بجھ گئی۔ زندگی کے بارے میں میرا پورا نقطۂ نظر بدل گیا۔ اب مجھے پوری طرح سکون اور خوشی حاصل ہے۔

اسلام اپنی ذات میں تبلیغ ہے۔ وہ خود بخود لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اگر مسلمان یک طرفہ صبر کے ذریعہ نفرت اور تناؤ کی فضا کو ختم کر دیں تو کسی رسمی تبلیغ کے بغیر اسلام لوگوں کے اندر نفوذ کرنا شروع کر دے گا۔

قیمت میں اضافہ

مہنگائی میں غیر معمولی اضافہ کی بنا پر تمام اخبار اور رسالے اپنی قیمتیں بڑھا چکے ہیں۔ مجبوراً فیصلہ کیا گیا ہے کہ الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ ماہ اکتوبر ۱۹۸۹ سے دونوں کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی:

فی شمارہ	پانچ روپیہ
سالانہ چندہ	ساٹھ روپیہ

صاحبانِ ایجنسی اگر تعداد میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں تو فوراً مطلع فرمائیں۔

قدرت کا فیصلہ

اگر آپ امریکہ جائیں اور وہاں سے کناڈا کی طرف سفر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ امریکہ اور کناڈا کی سرحد (Border) پر دونوں ملکوں کے جھنڈے ایک ساتھ لہرا رہے ہیں۔ پاس ہی ایک بورڈ ہے جس کے اوپر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا ہے ——— ایک ہی ماں کی اولادیں :

Children of a common mother

یہ بات جو امریکہ اور کناڈا کی سرحد پر کھلے بورڈ کے اوپر لکھی گئی ہے، یہی بات تمام دوسرے ملکوں کی سرحدوں پر چھپے بورڈوں میں نہ دکھائی دینے والے حرفوں میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ دوسرا بورڈ وہ ہے جو قدرت کی طرف سے لگایا گیا ہے۔ پہلا بورڈ انسانی ہاتھوں نے لکھا ہے، دوسرا بورڈ خود خدا کے ہاتھوں نے۔

جدید تحقیقات جو مانے کیول حیاتیات (Molecular biology) میں ہوئی ہیں، ان سے جینی شہادت (Genetic evidence) کے ذریعہ خالص سائنسی سطح پر یہ ثابت ہوا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ ایک ہی عظیم خاندان (Great family) کا حصہ ہیں۔ سب ایک ہی مشترک ماں باپ (Common ancestor) سے تعلق رکھتے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تعمیر کی طرف، صفحہ ۲۸ — ۳۰)

ایسی حالت میں گویا حقیقت واقعہ وہی ہے جو مذکورہ بورڈ پر امریکہ اور کناڈا کی سرحد پر نصب کی گئی ہے۔ وہی معاملہ تمام قوموں کا ہے جس کا اعلان امریکہ اور کناڈا نے اپنے یہاں کیا ہے۔ حیاتیاتی حقیقت کا تقاضا ہے کہ ہر قوم اپنے یہاں وہی الفاظ لکھے جو امریکہ اور کناڈا نے اپنے یہاں لکھ رکھا ہے۔

یہی موجودہ دنیا میں انسان کا امتحان ہے۔ یہاں آدمی کو اپنے آزاد ارادے سے وہی کام کرنا ہے جو قدرت نے لازمی قانون کے تحت پیشگی طور پر مقدر کر دیا ہے۔ جو چیز قدرت نے اپنے مخفی قلم سے لکھی ہے، اسے انسان کو اپنے ہاتھ سے اپنے صفحۂ حیات پر لکھنا ہے۔ قدرت کے اپنے منصوبہ کے تحت چیزوں کی جو اسکیم (Scheme of things) ہے، اس کے مطابق اپنے شعور اور عمل کو ڈھال لینا ہے۔ قدرت کے نقشہ سے مطابقت کا نام تعمیر ہے اور قدرت کے نقشہ سے عدم مطابقت کا نام تخریب۔

New Spirit of Cooperation

UNITED NATIONS, December 6, 1988.

NIKITA KHRUSHCHEV, the last Soviet communist party leader to address the general assembly, pounded a shoe on his desk and assured Americans that "we will bury you." Mr Mikhail Gorbachov's arrival 28 years later starkly underscores the transformation in the U.S. Soviet relations since he took control of the party. In diplomatic circles today, the talk is of cooperation, mutual interests, and multilateral diplomacy. Confrontation between the capitalist and socialist systems has taken a back seat. U.S. tycoons woo Mr Gorbachov and his staff hints at a visit to Wall Street, the antithesis of Soviet ideology. In 1960, Khrushchev was enraged over the then UN secretary-general, Mr Dag Hammarskjold's action in sending U.S. peacekeeping troops to the Congo, then a key Soviet client state. "The general assembly of 1960 was the greatest circus in the history of the United Nations," recalls Mr Brian Urquhart, who then was under secretary-general in charge of peacekeeping operations. Sometimes crude, profane and easily angered, Khrushchev created the most memorable scene in the history of U.N. debate when he interrupted a delegate's remarks by pounding a shoe on the Soviet delegation's desk for a point of order. "Khurushchev got so abusive that the Irish president of the assembly, Mr Frenddie Boland, broke the gavel in calling him to order, and the head of the gavel flew off into the general assembly," said Mr Urquhart. Mr Gorbachov is likely to provide no melodramatic fireworks. Unlike Khrushchev, Mr Gorbachov has rejected the idea that capitalism and socialism are mutually exclusive. This stress on cooperation in areas of mutual interest has been spilling over for some time into the UN.

The Soviet Union has in recent years relinquished its practice of vetoing many security council actions, and has negotiated consensus positions with the US, China, Britain and France. This new spirit of cooperation has led to the political settlement in Afghanistan and the cease-fire in the Iran-Iraq war, both of which would have been unlikely under the confrontative Soviet style of Khruschev or Mr Leonid I. Brezhnev. Under Mr Gorbachov, the Soviets have been promoting an aggressive though hazy new plan for comprehensive international security, in which the UN would play a key role in monitoring, verification and peacekeeping. Mr Gorbachov has also suggested that rulings of the world court, now merely advisory, be made binding on U.N. member nations, especially security council members. In his speech to the world body, Mr Gorbachov may expand upon previous Soviet proposals, which have included the establishment of a world space organisation, having all nations earmark troops for a standing army of U.N. peacekeepers, establishing a U.N. navy to escort commercial shipping in danger zones, and UN monitoring of disarmament and international arms sales. The US and other Western allies have lauded parts of the Soviet security proposals, but feel the whole package is too vague to endorse. A U.N. visit by a Soviet leader is a rarity — the foreign minister usually delivers the annual address to the general assembly. Between Khrushchev and Mr Gorbachov, the only other top-ranking Soviet visitor was premier Alexei N. Kosygin, the head of the Soviet government apparatus but less powerful than party chief Brezhnev, who came to the UN in 1967 to support Arab complaints against Israel. Mr Kosygin held a summit with the U.S. president, Mr Lyndon B. Johnson.

The thaw in East-West relations since Mr Gorbachov's ascension to power is all the more striking when compared with the tensions that prevailed at the UN only five years ago after the Soviet downing of Korean airline flight 007, with the loss of 269 lives. The Soviet foreign minister, Mr Andrei Gromyko, planned to come to the UN to explain his country's actions, but the governors of New York and New Jersey denied permission for his plane to land at their commercial airports, and the state department insisted on a landing at a military base. Mr Gromyko cancelled his visit. In the meantime, homeless activists angered by Gorbachov's plans to visit New York city's opulent Trump Tower are inviting the Soviet president to a homeless shelter and food line to get "a more balanced and realistic view of our nation."

The Times of India, December 7, 1988.

حقیقت پسندی

ٹائم میگزین (۱۳ فروری ۱۹۸۹) کے سرورق پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے: دوبارہ ساتھی (Comrades again)۔ جیسا کہ معلوم ہے، چین اور روس دونوں اگرچہ کمیونسٹ ملک ہیں، مگر ان کے درمیان کم از کم ۳۰ سال سے باہمی عداوت چلی آرہی تھی۔ اب دونوں ملک ایک دوسرے سے قریب آرہے ہیں۔ ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں اسی کو کور اسٹوری بنایا گیا ہے۔ اندر مضمون کے اوپر اس کی سرخی یہ ہے کہ ایک شگاف کی مرمت، عداوت کا دور ختم ہو رہا ہے:

To mend a rift — An era of hostility is coming to an end

چین اور روس کے درمیان ۴۵۰۰ میل کی مشترک سرحد ہے۔ مگر پچھلے تین دہوں سے دونوں کے درمیان تعلقات خراب تھے۔ سابق روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچیف نے ۱۹۵۹ میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے چین میں مختصر قیام کیا تھا اور ماوزی تنگ سے ملاقات کی تھی جو ناخوش گواری پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد سے دونوں ملکوں کا کوئی ذمہ دار شخص ایک ملک سے دوسرے ملک میں نہیں گیا۔ شدید دشمنی کے لمبے وقفہ کے بعد فروری ۱۹۸۹ میں پہلی بار سوویت روس کے وزیر خارجہ (Eduard Shevardnadze) نے چینی راجدھانی بیجنگ کا سفر کیا۔ اس سفر کا مقصد امن اور ترقی (Peace and development) بتایا گیا تھا۔ اس سفر میں جو باتیں طے ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ روسی وزیر اعظم میخائیل گورباچوف جلد ہی چین کا دورہ کریں گے (ٹائم ۱۳ فروری ۱۹۸۹)

دو حریف ملکوں میں اس خلاف توقع تبدیلی کے بارہ میں ایک چینی افسر نے کہا کہ بیجنگ اور ماسکو کو اس وقت جن مشکلات کا سامنا ہے، اس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے:

The difficulties that Beijing and Moscow now confront have brought us closer to one another. (p. 7).

ایک روسی افسر نے یہی بات زیادہ کھل کر ان لفظوں میں کہی کہ ہم اس مشترک سوچ کے بہت قریب آچکے ہیں کہ کس طرح دونوں ملکوں میں نئے تعلقات قائم کیے جائیں۔ ہم دونوں ہی نے ماضی میں

غلطیاں کی ہیں :

We are very close to understanding how new relations should develop. We have both made mistakes in the past (p. 6).

چین اور روس نے جب دیکھا کہ ان کی باہمی دشمنی ایک دوسرے کو نقصان پہونچا رہی ہے تو دونوں نے طے کیا کہ وہ بے فائدہ دشمنی کو ختم کرکے آپس میں دوستانہ تعلقات قائم کرلیں۔ اس نئے فیصلہ تک پہونچنے کے لیے انھیں اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنے مطالبات کو چھوڑ دینے پر راضی ہوئے۔ انھوں نے ایک ناقابل برداشت چیز کو برداشت کیا۔ تاکہ اپنے لیے زیادہ بہتر مستقبل کی تعمیر کرسکیں۔ اسی کا نام حقیقت پسندی ہے۔ اس حقیقت پسندی کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیابی تک پہونچنا ممکن نہیں۔

امریکہ اور روس اور چین موجودہ دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور قومیں ہیں۔ جب طاقت ور قوموں کا حال یہ ہے کہ حقیقت پسندی اور مفاہمت کے سوا ان کے لیے زندگی کا کوئی اور طریقہ نہیں، تو کمزور قومیں کیوں کر ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرکے زندہ رہ سکتی ہیں۔ ایسی حالت میں کمزور قوموں کے لیے حقیقت پسندی اور مفاہمت کا طریقہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے جتنا طاقت ور قوموں کے لیے۔

بمبئی میں الرسالہ اور اسلامی مرکز کی کتابوں کے لیے

مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:

KULSUM KITAB GHAR
9, Jama Masjid
Maulana Baba Lane
Bandra (West)
Bombay 400 050

Phone: 6425201
6428589

اطلاع کے بغیر

محمد اسماعیل صاحب (بمبئی) نے ایک "جماعت" کے ساتھ امریکہ اور کناڈا میں وقت لگایا۔ مارچ ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ ان کی جماعت کناڈا کے ایک شہر میں گشت کر رہی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ ایک مسلمان ڈاکٹر سے ملے۔ ڈاکٹر "داڑھی" والے لوگوں کو اچانک دیکھ کر غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ پیشگی اطلاع کے بغیر (Without prior intimation) کیسے آگئے۔ جماعت میں ایک ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ جناب، پیشگی اطلاع کے بغیر ہم آپ کے پاس اس لیے آگئے ہیں تاکہ آپ کو اس بات سے آگاہ کر دیں کہ اسی طرح ایک دن پیشگی اطلاع کے بغیر ایک اور شخص (ملک الموت) آپ کے پاس آنے والا ہے۔ وہ آپ کو ہمیشہ کے لیے یہاں سے اٹھا لے جائے گا:

We have come to tell you that a man will come to you one day without any prior intimation.

یہ خبر بلاشبہ تمام خبروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ ہر شخص کا اہم ترین ذاتی مسئلہ ہے۔ ضرورت ہے کہ تمام زندہ لوگوں کو اس خبر سے آگاہ کیا جائے، قبل اس کے کہ آنے والا ان کے پاس اچانک آجائے۔ حتی کہ ان لوگوں کو بھی اس خبر سے آگاہ کرنا ہے جو بظاہر اس کو مانتے ہیں۔ کیوں کہ جاننے والوں نے بھی اب تک اس کو نہیں جانا۔ ماننے والوں نے بھی ابھی اس کا یقین نہیں کیا۔

بھونچال کس قدر بھیانک واقعہ ہے۔ مگر وہ ہمیشہ پیشگی اطلاع کے بغیر آتا ہے۔ بھونچال کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہی ہے۔ یہی معاملہ موت کا بھی ہے۔ موت ایک فیصلہ کن قسم کا شخصی بھونچال ہے۔ وہ پیشگی اطلاع کے بغیر اچانک کسی روز آجاتی ہے۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے، اس کو بہر حال موت کا سامنا کرنا ہے۔ اس کو بہر حال موت کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دینا ہے۔

موت کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ وہ صرف خاتمہ نہیں، بلکہ نئی زندگی کا آغاز ہے۔ ایک ایسی زندگی جہاں آدمی کو خداوند عالم کی عدالت کے ترازو میں کھڑا ہونا ہے۔ جہاں اس کی ابدی جنت یا ابدی جہنم کا فیصلہ کیا جانا ہے۔ موت کا یہ پہلو اس کی سنگینی کو بے حساب حد تک بڑھا دیتا ہے۔

دونوں یکساں

ایس آر رابنسن (Sugar Ray Robinson) امریکہ کے باکسنگ کے کھلاڑی تھے۔ ان کو سب سے بڑا باکسر (Greatest boxer) کہا جاتا ہے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۸۹ کو لاس اینجلیز میں ان کا انتقال ہو گیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔ اپنے ۲۵ سالہ کیریر میں انھوں نے ۲۰۱ مقابلے کیے۔ ان میں سے ۱۷۴ مقابلوں میں وہ کامیاب رہے۔

باکسنگ میں رابنسن کا کمال اتنا بڑھا ہوا تھا کہ عالمی چیمپین محمد علی نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا۔ محمد علی نے ٹیلیفون پر رائٹر کے نمائندہ کو بتایا کہ رابنسن سب میں زیادہ بڑا فائٹر تھا۔ وہ واحد شخص ہے جو کہ مجھ سے بہتر تھا۔ مجھے اس کی محرومی کا احساس رہے گا :

He was the greatest fighter of all time
He's the only one who was better than me.
I'll miss him.

رابنسن دل کے مریض تھے۔ اپنی زندگی کا آخری سال انھوں نے آرام کرسی (Armchair) پر گزارا۔ آخر عمر میں بیماری کی وجہ سے ان کی یادداشت ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اپنی عظمت کے دنوں کو وہ بالکل بھول چکے تھے۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کرنے کے قابل نہیں رہے تھے :

He spent the last years of his life confined to an armchair, his memories of his glory days taken away by Alzheimer's disease. He could no longer remember the past.

یہی موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا حال ہے۔ ایک شخص ہر قسم کی جدوجہد اور قربانی کے بعد عظمت کا مقام حاصل کرتا ہے۔ مگر عظمت کے یہ دن صرف اس کی یادوں میں ہوتے ہیں۔ اگر بڑھاپا، یا بیماری یا حادثہ اس کی یاد کو اس سے چھین لے تو اس کی عظمت کے تمام قصے اس کے لیے غیر موجود ہو جائیں گے۔

جو عظمت اتنی بے وقعت ہو اس کی کیا حقیقت۔ اس کا پانا بھی اتنا ہی بے حقیقت ہے جتنا اس کا نہ پانا۔ یہاں ملنے اور نہ ملنے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔

بے خبری

ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ (Martin Luther King Jr) امریکہ کی کالی نسل (نیگرو) کے ایک لیڈر تھے۔ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ کو اٹلانٹا میں پیدا ہوئے۔ امریکہ میں نیگروؤں کی آبادی ۲۲ ملین ہے۔ انھیں سفید فام لوگوں کے برابر کا انسان نہیں سمجھا جاتا۔ مارٹن لوتھر کنگ اپنی قوم کو شہری حقوق (Civil rights) دلوانے کے لیے اٹھے۔ انھوں نے تشدد کو چھوڑ کر غیر متشددانہ مقاومت (Nonviolent resistance) کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کے اندر غیر معمولی تقریری صلاحیت تھی۔ چنانچہ وہ بہت جلد مقبول ہو گیے۔ وہ اپنی تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ ہم ایک تخلیقی جنگ میں مصروف ہیں تاکہ اپنے اوپر سے نسلی بے انصافی کی لمبی رات کو ختم کر سکیں:

We are engaged in a creative battle to end the long night of racial injustice (10/473).

مارٹن لوتھر کنگ کا غیر معمولی اعتراف ان کی زندگی ہی میں اس طرح کیا گیا کہ ۱۹۶۴ میں ان کو امن (Peace) کا نوبیل انعام دیا گیا۔ تاہم سفید فام نسل سے تعلق رکھنے والوں کا ایک طبقہ ان سے ناراض ہو گیا۔ چنانچہ ایک سفید فام امریکی جیمز ارل رے (James Earl Ray) نے ۴ اپریل ۱۹۶۸ کو گولی مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔ اس آدمی پر مقدمہ چلا۔ امریکی عدالت نے اس کو ۹۹ سال قید کی سزا دی۔ مارٹن لوتھر کنگ کی تدفین کے بعد ان کی قبر پر جو کتبہ لگایا گیا اس پر درج ہے، آخر کار آزاد:

Free at last

مارٹن لوتھر کنگ کے ساتھیوں کے نزدیک آزادی یہ تھی کہ وہ سفید فام نسل کے غلبہ سے رہائی حاصل کر لیں۔ موت نے جب ان کے لیڈر کو سفید فام لوگوں کے قبضہ سے دور کر دیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ اب وہ آزاد ہو گیا۔ مگر یہ صرف بے خبری کی بات ہے۔ انسان کی آزادی حقیقۃً یہ ہے کہ اس کو آنے والی اصلی اور طویل تر دنیا میں جہنم سے رہائی ملے۔ اس کو ابدی جنت کا مستحق قرار دیا جائے۔

دنیا کے کتنے آزاد آخرت میں غلام نظر آئیں گے، اور کتنے غلام آخرت میں آزاد قرار دیے جائیں گے۔ مگر اکثر لوگ اس سب سے بڑی حقیقت کو نہیں مانتے۔

۶ اپریل

اشتراکی روس کے پہلے حکمراں لینن کا انتقال ۱۹۲۴ میں ہوا۔ اس کے بعد جوزف اسٹالن روس کا وزیر اعظم بنا۔ اور اپنی وفات (۱۹۵۳) تک اس عہدہ پر باقی رہا۔ اس نے تقریباً ۳۰ سال تک اشتراکی روس کے اوپر مطلق العنان حکومت کی۔ اس دوران اس نے بے شمار مظالم کیے۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً ۵۰ ملین انسانوں کو مختلف طریقوں سے ہلاک کر ڈالا (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ اپریل ۸۸)

اسٹالن کے پورے دور حکومت میں اس کے مظالم اس طرح مکمل طور پر چھپائے جاتے رہے کہ اس کا ایک لفظ بھی اشتراکی روس کی وسیع مملکت میں کہیں شائع نہ ہو سکا۔ بعد کے ایک روسی وزیر اعظم نکیتا خرشچیف نے کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس میں بند کمرے کے اندر اس کے بھیانک جرائم پر ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ یہ واقعہ ۲۵ فروری ۱۹۵۶ کا ہے۔ مگر اس کے باوجود خرشچیف کی یہ رپورٹ نہ روس کے ملکی اخبارات میں چھپنے کے لیے دی گئی اور نہ بیرونی اخبارات میں۔ اسٹالن کے مظالم کا راز بدستور راز بنا رہا۔

مگر ۶ اپریل ۱۹۸۹ کو اس راز کا پردہ پھٹ گیا۔ اس واقعہ کے ۳۳ سال بعد، اور اصل مظالم کے نصف صدی سے بھی زیادہ بعد، اس رپورٹ کو شائع کر دیا گیا ہے۔ ماسکو سے شائع ہونے والے ایک سرکاری ماہنامہ نیوز (News) نے ۶ اپریل ۱۹۸۹ کو خرشچیف کی یہ رپورٹ مکمل طور پر شائع کی ہے، اور اس کا عنوان ہے ـــــ شخصیت پرستی اور اس کے اثرات :

On the personality cult and its consequences.

موجودہ دنیا میں آدمی سرکشی کرتا ہے۔ وہ اپنی بڑائی قائم رکھنے کی خاطر حق کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر بھی اس کو اپنی اصل حیثیت پر پردہ ڈالنے کے لیے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ہمیشہ کے لیے اپنی بداعمالیوں کو چھپا لیا۔ مگر جس طرح اسٹالن کے لیے "۶ اپریل" کی تاریخ طے تھی، اور اس تاریخ کے آتے ہی وہ ساری دنیا کے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ اسی طرح ہر انسان کے لیے ایک ۶ اپریل مقدر ہے۔ اس کے آتے ہی ہر آدمی کی حقیقت صفحہ اول کی خبر بن جائے گی جس طرح ۶ اپریل ۱۹۸۹ کو اسٹالن کی حقیقت صفحہ اول کی خبر بن گئی۔

یہ دن بہر حال ہر انسان پر آنے والا ہے، خواہ وہ آج آئے یا آج کے ۵۰ سال بعد۔

فخر یا شکر

مز بھارتی مکھرجی ایک ہندستانی خاتون ہیں۔ ۱۹۶۱ سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے —— درمیانی آدمی اور دوسری کہانیاں :

The Middleman and Other Stories

اس کتاب کو ۱۹۸۸ کی بہترین کہانی (The best fiction of 1988) قرار دیتے ہوئے گراں قدر انعام دیا گیا ہے۔ یہ انعام نیویارک کے ادارہ National Book Critics Circle نے ان کو دیا ہے۔

مز بھارتی مکھرجی منہاٹن (امریکہ) میں رہتی ہیں۔ مذکورہ انعام کی خبر معلوم ہونے کے بعد نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۳ جنوری ۱۹۸۹) نے مز بھارتی سے ٹیلی فون پر ربط قائم کیا اور ان سے پوچھا کہ انعام کی خبر جب آپ نے سنی تو آپ پر کیا تاثر ہوا۔ مز بھارتی نے جواب دیا کہ اس سے مجھ پر ایک تموج کی کیفیت طاری ہوگئی ہے :

I am thrilled about it

دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ملیں گے جن کو ان کے کسی کارنامہ پر انعام اور تحسین ملے تو ان پر تموج (تھرل) کی کیفیت طاری ہوجائے۔ مگر ایسا آدمی شاید ساری دنیا میں ایک بھی نہیں جس کو اس منعم حقیقی کے عطیہ پر تموج (تھرل) کی کیفیت پیدا ہو جس کے دیئے ہوئے جسم اور دماغ اور موافق حالات کو استعمال کرکے اس نے یہ کارنامہ انجام دیا۔

غیر معمولی صلاحیتوں والا ذہن، انتہائی موزوں جسم اور بے شمار موافق حالات ہی کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی شخص سوچے، منصوبہ بنائے اور عمل کرکے اس کو تکمیل تک پہونچائے۔ اور یہ سب کچھ بلاشبہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کارنامہ خدا کا کارنامہ ہے۔ ہر کارنامہ کا فضل خدا کو پہنچتا ہے۔ آدمی اس راز کو جانے تو وہ اپنی ہر کامیابی پر خدا کے آگے سجدہ میں گر جائے۔ مگر نادان انسان اس کو اپنا کارنامہ سمجھ لیتا ہے۔ جس واقعہ پر اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرنا چاہیے، اس کو وہ اپنے لیے فخر کا سرمایہ بنالیتا ہے۔

السلام علیکم

اسلام میں زندگی کے جو آداب بتائے گیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملیں تو وہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ یعنی ایک شخص کہے کہ السلام علیکم (تمہارے اوپر سلامتی ہو) اس کے بعد دوسرا شخص جواب میں کہے: وعلیکم السلام (تمہارے اوپر بھی سلامتی ہو)

سلام کا یہ کلمہ ایک قسم کی دعا ہے۔ ایک مومن کے دل میں دوسرے مومن کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک مذکورہ سلام کا طریقہ ہے۔ سلام کی بہترین تشریح وہ ہے جو ابن عیینہ سے نقل کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ سلام کیا ہے۔ سلام کرنے والا دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے محفوظ ہو (هل تدري ما السلام، يقول انت آمن مني)

سلام کی یہ تشریح بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر اعتبار سے تمہارا خیر خواہ ہوں۔ میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا کرنے والا نہیں۔

تم سے میری گفتگو ہو تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا کہ میں تم سے بدکلامی کرنے لگوں۔ تمہارے ساتھ میرا کوئی لین دین ہو تو میں تمہارے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ نہیں کروں گا۔ بلکہ تمہارا جو حق ہے، اس کو انصاف اور دیانت کے ساتھ پورا پورا ادا کروں گا۔ تمہارے خلاف اگر مجھے کوئی شکایت ہو جائے تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں عدل کے راستہ سے ہٹ جاؤں اور تمہارا دشمن بن کر تمہاری جڑ کاٹنے لگوں۔ تم سے اگر مجھے کوئی اختلاف ہو تو میں اس اختلاف کو جائز تنقید کے دائرہ میں رکھوں گا، میں اس کو عیب جوئی، الزام تراشی اور کردار کشی کی حد تک ہرگز نہیں لے جاؤں گا۔

السلام علیکم کوئی رسمی کلمہ نہیں، وہ بااصول زندگی گزارنے کا ایک عہد ہے۔ السلام علیکم کہنے والا گویا اس بات کا اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں اس کا سلوک دوسروں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ وہ سلامتی اور خیر خواہی کا ہوگا نہ کہ بے امنی اور بدخواہی کا۔

بد دعا نہیں

لیس لک من الامر شئ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون۔ وللہ ما فی السماوات وما فی الارض یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء واللہ غفور رحیم
(آل عمران ۱۲۸-۲۹)

تم کو کچھ اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے، کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ کافروں اور مشرکوں پر لعنت کی اور ان کے خلاف بد دعا کی۔ اس پر یہ آیتیں اتریں۔ اس آیت میں ان کافروں اور مشرکوں کو صاف طور پر "ظالم" کہا گیا ہے۔ مگر ظالم ہونے کے باوجود پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ آپ ان پر لعنت بھیجیں اور ان کے خلاف بد دعا فرمائیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت مختلف روایتیں جمع کی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آیت کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم کچھ روایتوں کو مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔

امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز فجر کی دوسری رکعت میں جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد یہ کہتے: اللھم العن فلانا و فلانا (خدایا فلاں اور فلاں پر لعنت کر) اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی (اور لعنت سے منع کر دیا) امام احمد نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ کہتے تھے کہ اے اللہ، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ پر لعنت کر، اس پر مذکورہ آیت اتری (اور آپ کو لعنت سے منع کر دیا گیا)

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مشرکین میں سے کچھ لوگوں کا نام لے کر ان کے خلاف بد دعا کرتے تھے۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت اتاری (تو آپ نے بد دعا چھوڑ دی)

امام بخاری نے ایک اور روایت میں نقل کیا ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تو آپ نے کہا کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری

(اور آپ اپنے قول سے باز آگئے) امام احمد نے روایت کیا ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دانت ٹوٹ گیے اور آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ یہاں تک کہ آپ کے چہرہ پر خون بہہ پڑا۔ آپ نے کہا کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی۔ جس نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا کیا، حالاں کہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف بلا رہا تھا۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری (اس کے بعد آپ رک گیے) تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۳ - ۴۰۲

سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت اور اس کی تشریحی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفینِ اسلام کے کھلے ہوئے ظلم کے باوجود ان پر لعنت کرنا یا ان کے خلاف بد دعا کرنا جائز نہیں۔ جارحیت کی صورت میں بشرط استطاعت ان سے دفاع کیا جائے گا، مگر عین اس وقت بھی ان کے خلاف بد دعا نہیں کی جائے گی جب کہ وہ میدانِ جنگ میں اترے ہوئے ہوں، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ انھوں نے پیغمبرِ خدا کو زخمی کر دیا ہو۔

اسی کا نام داعیانہ اخلاق ہے۔ داعی کو ہر حال میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ داعی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے مدعو سے نفرت کرنے لگے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی حکم ہے کہ داعی اس کو برداشت کرے۔ وہ دعا گوئی کی حد تک اس کا خیر خواہ بن جائے۔

داعی کی یہ روش اس کی دعوت کو طاقت ور بناتی ہے۔ وہ اس کے دعوتی عمل کو تسخیری عمل کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔

حیدرآباد میں الرسالہ اور اسلامی مرکز کی کتابوں کے لیے

مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:

AL-RISALA ACADEMY
3-5-780/19/2, King Kothi
Opposite: Azam Manzil
HYDERABAD 500 039

Phone: 231607

نکاح وطلاق

نکاح سے پہلے

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب کسی عورت سے نکاح کا پیغام دے تو اگر اس شخص کے لیے ممکن ہو کہ وہ اسے دیکھے تاکہ اس سے نکاح کی طرف رغبت ہو تو وہ ضرور ایسا کرے (اذا خطب احدکم المرأۃ فان استطاع ان ینظر الی ما یدعوہ الی نکاحہا فلیفعل)

حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ کیا تم نے اس عورت کو دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو نکاح سے پہلے دیکھ لو۔ کیوں کہ اس طرح زیادہ امید ہے کہ تم دونوں کے تعلق میں استواری پیدا ہوگی (قال خطبتُ امرأۃ۔ فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل نظرتَ الیھا۔ قلتُ لا۔ قال فانظُر الیھا فانہ احریٰ ان یؤدم بینکما)

نکاح کے بعد

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ حلال اللہ کے نزدیک طلاق ہے (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ابغض الحلال الی اللہ الطلاق)

معاذ بن جبل کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے معاذ، اللہ نے زمین پر سب سے زیادہ محبوب چیز جو پیدا کی وہ غلام کو آزاد کرنا ہے، اور اللہ نے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز جو زمین پر پیدا کی وہ طلاق ہے (قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا معاذ، ما خلق اللہ شیئاً علیٰ وجہ الارض احبّ الیہ من العتاق۔ ولا خلق اللہ شیئاً علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق)

ان روایات سے نکاح و طلاق کے بارہ میں اسلام کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ آدمی نکاح سے پہلے تو خوب سوچے۔ مگر نکاح کے بعد وہ صرف نباہنے کی کوشش کرے۔ اسلام میں غیر عورت کو بالقصد دیکھنا جائز نہیں۔ مگر مخطوبہ کو دیکھنے کی کھلی اجازت دی گئی۔ دوسری طرف طلاق کو ابغض المباحات قرار دیدیا گیا۔ گویا نکاح سے پہلے تحقیق کے لیے ممنوعہ حد تک جانے کی اجازت ہے۔ مگر نکاح کے بعد مباح حد کے اندر داخلہ بھی پسند نہیں۔

حاضر جوابی

مولانا سعید احمد خاں سلطان پوری، جمعیۃ علماء ہند کے آرگنائزر تھے۔ لوگ انھیں ازراہِ محبت "دادا" کہا کرتے تھے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۸۹ کو اپنے وطن سلطان پور میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔

وہ نہایت حاضر جواب آدمی تھے۔ ایک بار کا قصہ ہے۔ وہ مسجد عبدالنبی (نئی دہلی) میں ایک مجلس کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک خوش پوش، بلند قامت آدمی آکر سامنے کھڑے ہوگیے۔ انھوں نے تیز و تند لہجہ میں کہا کہ آپ کے دفتر کے کارکن نہایت بدتمیز ہیں۔ وہ ہم جیسے لوگوں کا احترام نہیں کرتے۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل تھی :

مولانا سعید احمد : آپ کون صاحب ہیں۔

نووارد : مجھ کو آپ نہیں جانتے، میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔

مولانا سعید احمد : جی ہاں، نہیں جانتا۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔

نووارد : میں اس زمانہ کا نبی ہوں، اور .....

مولانا سعید احمد : اگر تم نبی ہو تو میں تمہارا خدا ہوں۔ تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔

اپنے موقع کے لحاظ سے یہ بلاشبہ بہترین جواب تھا۔ بعض مواقع پر علمی اور منطقی جواب زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے ہیں جہاں جواب کا وہ انداز زیادہ کارآمد ہے جس کی ایک مثال مذکورہ گفتگو میں نظر آتی ہے۔

اسی کو عام زبان میں حاضر جوابی کہتے ہیں۔ حاضر جوابی ایک اعلیٰ انسانی صلاحیت ہے۔ تاہم استعمال کے اعتبار سے اس کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس خداداد صلاحیت کو باطل کے توڑ کے لیے استعمال کیا جائے جس کی ایک مثال اوپر کا واقعہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اس صلاحیت کو لوگوں کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال کرے۔ اس کا پہلا استعمال بلاشبہ مطلوب ہے، اور اس کا دوسرا استعمال بلاشبہ غیر مطلوب۔

محسن کشی کیوں

یکم دسمبر ۱۹۸۸ کو مسٹر کمال بی کام (علیگ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ دہلی میں بزنس کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض تلخ تجربات کی روشنی میں ایک سوال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جس آدمی کے اوپر احسان کیا جائے وہی بعد کو اپنا دشمن بن جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ عربی زبان میں ایک پرانا مثل ہے: اتق شر من احسنت الیہ (اس آدمی کے شر سے بچو جس کے اوپر تم نے احسان کیا ہے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم دو ہزار سال سے لوگوں کو وہی تجربہ ہو رہا ہے جس کا تجربہ آپ پر گزرا۔

پھر میں نے کہا کہ آدمی کے اندر سب سے زیادہ بڑھا ہوا جذبہ خود پسندی کا جذبہ ہے۔ اسی خود پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کسی کا اعتراف نہیں کرتا، وہ کسی کو اکنالج (Acknowledge) کرنا نہیں چاہتا۔ احسان فراموشی یا محسن کشی کی روش دراصل انسان کے اسی مزاج کا نتیجہ ہے۔

جب آپ کسی کے ساتھ احسان کرتے ہیں تو آپ اس کو کوئی چیز دیتے ہیں۔ یہاں اس کی پیدائشی فطرت زور کرتی ہے کہ وہ آپ سے ملی ہوئی چیز کو آپ کا عطیہ کہے۔ اس کا ضمیر بار بار اس کے لیے آواز دیتا ہے۔ مگر اس کی خود پسندی اس اعتراف پر راضی نہیں ہوتی۔

اب آدمی کے اندر ایک خاموش کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک طرف فطرت ہوتی ہے اور دوسری طرف انانیت۔ آخر کار آدمی کا سرکش دماغ اس کا ایک حل نکال لیتا ہے۔ وہ آپ کو بدنام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ آپ کے خلاف جھوٹی باتیں گھڑ کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے آپ بہت برے آدمی ہیں۔ بظاہر یہ بات وہ دوسروں سے کہہ رہا ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت اس کا مخاطب اس کی اپنی ذات ہوتی ہے، اس طرح وہ اپنی فطرت کی آواز کو یہ کہہ کر دباتا ہے کہ وہ تو بہت برا آدمی ہے، وہ اس قابل نہیں کہ اس کی کسی خوبی کا اعتراف کیا جائے۔

نفسیات کی زبان میں اس روش کو خود فریبی (Self-deception) کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، اپنے سوا کسی اور کو نہیں (وما یخدعون الا انفسھم)

یہ کہنا کہ فلاں آدمی نے میرے ساتھ احسان کیا ہے، گویا یہ کہنا ہے کہ وہ بڑا ہے اور میں چھوٹا ہوں۔ کسی کے احسان کو ماننا، اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا کر لینے کے ہم معنی ہے۔ چونکہ آدمی اپنے کو چھوٹا کرنے پر راضی نہیں ہوتا اس لیے وہ برعکس طور پر یہ کرتا ہے کہ دوسرے کو چھوٹا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ سے کہا گیا کہ فلاں آدمی آپ کی برائی کرتا ہے۔ بزرگ نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، کیوں کہ میں نے اس کے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا ہے۔

بزرگ کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ جب آپ کسی کے ساتھ ایک احسان کرتے ہیں تو آپ اس کو ایک چیز دیتے ہیں۔ اب اس آدمی کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ یہ چیز آپ کی دین ہے، وہ اس کو آپ کے ذریعہ سے ملی ہے۔

مگر اس قسم کے اعتراف سے آدمی کی انا پر ضرب پڑتی ہے۔ یہ آپ کی بڑائی کو ماننا ہے، اور کسی دوسرے کی بڑائی کو ماننا آدمی کے لیے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وہ نفسیاتی پیچیدگی ہے جو آدمی کو اس طرف لے جاتی ہے کہ وہ اپنے محسن کی برائی کرنا شروع کر دے۔ ایسا کر کے گویا وہ اپنی بڑائی کے احساس کو محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہر کرتا ہے کہ جو چیز اس کے پاس ہے وہ اس کی اپنی لیاقت سے حاصل کی ہوئی چیز ہے نہ کہ کسی کے دینے سے اس کو ملی ہے۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام دوسرے شخص کے کمال کا اعتراف ہے۔ دوسرے کا اعتراف ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ آدمی اپنی نفی کرنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ دوسرے کا اعتراف بھی نہیں کرتا۔

احسان کے واقعہ میں آدمی مزید ایک مشکل میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ دوسرے کا اعتراف نہ کرے تب بھی دوسرے کی دی ہوئی چیز جو اس کے پاس ہے، وہ ہر وقت اس کو یاد دلاتی ہے کہ فلاں شخص تم سے بڑا ہے، وہ تم کو دینے والا ہے اور تم اس سے پانے والے۔ اس نفسیاتی مسئلہ کی بنا پر آدمی محسن کے بارہ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ملی ہوئی چیز کو دوسرے کا عطیہ بتائے یا اپنا کارنامہ ثابت کرے۔ یہاں وہ اپنی انا کو باقی رکھنے کی خاطر یہ تدبیر نکالتا ہے کہ محسن کی برائی کرنا شروع کر دیتا ہے۔

صبر کی اہمیت

ایک فلسطینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے دین میں صبر کی اہمیت کا ذکر کیا اور صبر سے متعلق قرآن کی آیتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ انھوں نے فوراً کہا: صبر کی آیتیں تو مکی دور میں اتری تھیں۔ ہجرت کے بعد صبر کا حکم منسوخ کر دیا گیا اور جہاد و قتال کی آیتیں اتاری گئیں۔ اب ہم دور صبر میں نہیں ہیں۔ اب ہم دور جہاد میں ہیں۔ اب ہمارے تمام معاملات جہاد کے ذریعہ درست ہوں گے اور یہی کام ہمیں کرنا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جس میں بے شمار لوگ مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک ابدی حکم ہے۔ اس کا تعلق ہر دور اور ہر زمانہ سے ہے۔ صبر تمام دینی اعمال کا خلاصہ ہے۔ آدمی کوئی دینی عمل صحیح طور پر اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اس کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ جس آدمی سے صبر رخصت ہو جائے، وہ کوئی بھی دینی کام صحیح ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا، خواہ وہ کلمۂ توحید پر استقامت کا معاملہ ہو یا میدان مقابلہ میں شجاعت کا معاملہ۔ یا اور کوئی معاملہ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے، اور علی الاطلاق طور پر اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں صبر کا مادہ ایک سو سے زیادہ بار استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ ایک مدنی سورۃ ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ تم لوگ صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (استعینوا بالصبر والصلاۃ ان اللہ مع الصابرین البقرہ ۱۵۳)

حدیث میں صبر کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے صبر سے زیادہ اچھا اور بڑا عطیہ کسی شخص کو نہیں دیا (وما أُعطِیَ أحَدٌ عطاءً خیراً و اوسع من الصبر) ایک اور حدیث میں ہے کہ صبر مومن کا بھروسہ ہے (الصبرُ معوّلُ المسلم)

صبر کے لفظی معنی رکنے کے ہیں۔ امام راغب نے صبر کی حقیقت ان لفظوں میں بیان کی ہے:

الصبر حبس النفس علی ما یقتضیہ العقل (صبر اس چیز سے نفس کو روکنے کا نام ہے جس کا عقل تقاضا کرے) عربی میں کہا جاتا ہے کہ صبرت نفسی عن کذا۔ یعنی میں نے اپنے نفس کو فلاں چیز سے روک دیا۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں موافق پہلوؤں کے ساتھ ناموافق پہلو بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کسی کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے لئے صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہاں اپنی خواہش کو دبا کر اپنی عقل کو رہنما بنانا پڑتا ہے۔ یہاں ایک چیز کو لینے کے لئے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آج پر توجہ دینے کے لئے کل کو مستقبل کے خانہ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہاں خلاف مزاج باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں ردعمل کی نفسیات سے آزاد رہ کر مثبت سوچ کے تحت اپنا منصوبہ بنانا پڑتا ہے۔ ان تمام چیزوں کا تعلق صبر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں صبر کے بغیر کبھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

دنیوی کاموں کی طرح، دینی کام کے لئے بھی صبر لازمی طور پر ضروری ہے۔ جس زمین پر اور جس انسانی ماحول میں ایک دنیادار کام کرتا ہے اسی زمین پر اور اسی انسانی ماحول میں دیندار بھی اپنا عمل کرتا ہے۔ اس لئے یہاں دینی مقصد کو پانے کے لئے بھی صبر کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ صبر کے بغیر کوئی بھی دینی کام نتیجہ خیز طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام کی تاریخ وسیع تقسیم کے مطابق، تین قسم کے حالات سے گزری ہے ــــ دعوت، خلافت، ملوکیت۔ دعوتی دور کی معیاری مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ۲۳ سالہ زمانہ ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے مطالعہ سے دعوت کے آداب اور اس کے طریقے صحیح طور پر معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد خلافت کا زمانہ آتا ہے جو گویا صحیح معنی میں نائبین رسول کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ سے شروع ہوتا ہے اور حضرت علی ابن ابی طالب پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد، مورخین اسلام کے مطابق ملوکیت کا دور ہے۔ یہ زمانہ حضرت امیر معاویہ سے شروع ہوا اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔

ان تینوں دوروں میں جو اسلامی کردار مطلوب ہے، اس پر قائم ہونے کے لئے یکساں طور پر صبر کی اہمیت ہے۔ یہاں ہم تینوں دوروں کے بارے میں کلام کریں گے۔ پہلے دونوں دوروں

کے بارے میں مختصر طور پر اور تیسرے دور کے بارہ میں زیادہ مفصل طور پر۔

دعوت کا دور

محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ بیعت عقبہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور خون بہانا آپ کے لئے حلال نہیں کیا گیا تھا۔ آپ کو حکم تھا کہ آپ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ اور تکلیفوں پر صبر کریں۔ اور جاہلوں سے روگردانی کریں۔ قریش کا یہ حال تھا کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ آپ کی پیروی کرتے وہ ان پر ظلم کرتے۔ ان کے دین کے بارہ میں انھیں سخت آزمائش میں مبتلا کرتے۔ قریش نے ان کو ان کی بستیوں سے نکال دیا۔ چنانچہ آپ کے پیروؤں میں سے کچھ لوگ سخت آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ اور کچھ لوگ قریش کے ہاتھ سے تکلیفوں کا شکار ہوئے۔ اور کچھ لوگ ان سے بچنے کے لئے دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ ایک جماعت حبش چلی گئی۔ کچھ لوگوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یا اور کسی طرف چلے گئے۔ جب قریش نے اس طرح اللہ کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کی اور اللہ نے ان کے لئے جس عزت کا ارادہ کیا تھا اس کو رد کر دیا، اور اپنے نبی کو جھٹلایا۔ اور ان لوگوں کو تکلیف دی اور جلاوطن کیا جنھوں نے اللہ کی عبادت کی اور اس کو ایک مانا اور اس کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اس وقت اللہ نے اپنے رسول کو جنگ کی اجازت دی اور ان لوگوں کے لئے حفاظت اور مدد کا وعدہ کیا جن پر ظلم اور زیادتی ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اس اجازت کے بارے میں سب سے پہلے سورۃ الحج (آیت ۳۹۔۴۱) اتاری گئی۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۷۵)

مکہ کا دور دعوت کا دور تھا۔ اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حکم تھا کہ اپنی ساری توجہ صرف دعوت پر مرتکز رکھیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے خواہ کتنی ہی دل آزاریاں کی جائیں اور کتنی ہی تکلیفیں پہنچائی جائیں ان پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ یک طرفہ طور پر صبر و برداشت پر قائم رہتے ہوئے دعوت کا مثبت کام جاری رکھیں۔

دعوت کا کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک داعی کے دل میں مدعو کی خیر خواہی نہ ہو۔ یہ خیر خواہی اتنی زیادہ ہونی چاہئے کہ مدعو کی زیادتیوں کے باوجود اس کے حق میں داعی کے

دل سے ہدایت کی دعائیں نکلتی رہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑایا اور آپ پر پتھر مارے، ان کے بارہ میں آپ نے یہ دعا فرمائی کہ خدایا، میری قوم کو ہدایت دے ؛ وہ نہیں جانتے (رب اھد قومی فانھم لا یعلمون)

خلافت کا دور

خلافت کا دور اقتدار کا دور ہے۔ اقتدار، عین اپنی طبیعت کے اعتبار سے بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اس لئے دور خلافت (دور اقتدار) میں صبر کی اہمیت، ہمیشہ سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

۱۔ دور خلافت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر عہدوں کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ ہر آدمی یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو ایک اچھا سیاسی عہدہ مل جائے۔ اگر یہ مزاج باقی رہے تو خلافت کا پورا نظام برباد ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں صبر (اپنی خواہشات کو روکنا) اس بات کی ضمانت ہے کہ خلافت کے دور میں عہدوں کی طلب کی برائی نہ پیدا ہو۔ عہدے اگر اہلیت کی بنیاد پر دئے جائیں تو اس سے خلافت کا نظام طاقت ور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عہدے اگر خواہشات کی بنیاد پر دئے جانے لگیں تو خلافت کا پورا نظام کمزور ہو کر رہ جائے گا۔ ایسی حالت میں خلافت کے نظام کو صحت مند حالت پر باقی رکھنے کے لئے صبر کی صفت انتہائی طور پر ضروری ہے۔

دور اول میں اس کی ایک عظیم الشان مثال انصار کا اس پر راضی ہونا ہے کہ وہ عہدہ خلافت کے معاملہ میں قریش سے نزاع نہیں کریں گے۔ انصار نے اسلامی انقلاب لانے کے لئے یکساں طور پر قربانیاں دی تھیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس شخص کو خلیفہ بنایا جائے تو حضرت ابو بکر صدیق نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔ اگر قریش کے باہر کسی کو خلیفہ بنایا جائے تو، تاریخی روایت کی بنا پر، اہل عرب کے لئے وہ قابل قبول نہ ہوگا اور لوگ اس کی اطاعت سے انکار کر دیں گے۔ انصار نے اس مصلحت کی اہمیت کو محسوس کیا اور خلافت کے مطالبہ سے دست بردار ہو گئے۔

انصار کا یہ فعل بلاشبہ اسلامی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ اگر وہ اپنی قربانیوں کی فہرست بتا کر عہدۂ خلافت کے لئے اصرار کرتے تو یقینی تھا کہ مسلمان اقتدار کی رسہ کشی میں مشغول ہو جاتے اور اسلام کی تاریخ بننے سے پہلے مدینہ میں دفن ہو جاتی ـــــ یہ واقعہ بلاشبہ صبر کا واقعہ ہے۔ انصار کے اندر اگر صبر کا مادہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔

۲۔ حکومت ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق پورے ملک سے ہوتا ہے۔ ملک میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی، جاہل بھی اور عالم بھی، نرم بھی اور سخت بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خلیفہ (حکمراں) کو لوگوں کی طرف سے تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خلیفہ اگر لوگوں کی تنقیدوں کو برداشت نہ کرے اور اس کو ذاتی انتقام کا مسئلہ بنا لے تو وہ کبھی انصاف نہیں کر سکتا۔ خلیفہ کو عدل پر قائم رکھنے کے لئے لازمی طور پر یہ صفت درکار ہے کہ وہ لوگوں کی تنقیدوں کو برا نہ مانے۔ لوگوں کی سخت کلامی کے باوجود وہ ان کے ساتھ نرمی اور اعتدال کا رویہ اختیار کرے۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر کے ایک سرکاری فرمان کو ایک بار حضرت عمر نے برسرعام پھاڑ کر پھینک دیا مگر خلیفۂ اول نے اس کو برا نہیں مانا اور نہ اس بنا پر ان کے دل میں عمر فاروق کی اہمیت کم ہوئی۔ حضرت عمر فاروق جب خلیفہ ہوئے تو بار بار ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان پر سخت الفاظ میں تنقیدیں کیں۔ مگر حضرت عمر نے کبھی ان کے خلاف منفی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ مثلاً ایک بار تقریر کے دوران برسرعام ایک شخص نے کہا کہ اگر ہم تمہارے اندر ٹیڑھ دیکھیں گے تو ہم اپنی تلوار سے تمھیں سیدھا کر دیں گے۔ خلیفۂ ثانی اس پر غصہ نہیں ہوئے بلکہ یہ کہا کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے ایک ایسی قوم میں بنایا کہ اگر میرے اندر انحراف پیدا ہو تو وہ اپنی تلواروں سے مجھے سیدھا کر دے۔

خلیفہ کے اندر تنقید کو برداشت کرنے کا یہ مادہ انتہائی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ ملک اور قوم کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اعلیٰ صفت کسی شخص کے اندر اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اس میں صبر کا مادہ موجود ہو۔ صبر کسی خلیفہ کو عدل پر قائم رکھتا ہے، اگر اس کے اندر صبر نہ ہو تو کوئی بھی چیز اس کو ظلم کی راہ پر جانے سے روک نہیں سکتی۔

ملوکیت کا دور

اسی طرح ملوکیت کے دور میں بھی صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ کا آنا لازمی ہے، اسی طرح ملوکیت کا زمانہ بھی ضرور آکر رہتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر ملوکیت کے نظام پر صبر نہ کیا جائے تو مسلم معاشرہ میں زبردست خلفشار برپا ہوگا۔ امت دو طبقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک، ملوک اور ان کے ساتھی۔ دوسرے، عوام اور ان کے رہنما۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف مسلح اور غیر مسلح لڑائی شروع کر دیں گے، جس کا انجام دو طرفہ بربادی کے سوا اور کسی شکل میں نہیں نکلے گا۔

ایسے حالات میں صبر یہ کارنامہ انجام دیتا ہے کہ لوگ حکمرانوں سے اعراض کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسرے تعمیری اور اصلاحی میدانوں میں اپنے آپ کو مصروف کریں۔ اس طرح نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی طاقت ضائع ہونے سے بچ کر اپنا مفید استعمال پالیتی ہے، بلکہ اگر یہ غیر سیاسی اصلاحی کوششیں زیادہ بڑے پیمانہ پر صالح معاشرہ کی تشکیل کر سکیں تو بالواسطہ طور پر حکومت کا ادارہ بھی ضرور متاثر ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مقصد جو براہ راست عمل کے ذریعہ حاصل نہیں ہوا تھا، وہ بالواسطہ عمل کے ذریعہ حاصل کر لیا جاتا ہے۔

صبر، خواہ وہ دعوت کے مرحلہ میں ہو یا خلافت اور ملوکیت کے مرحلہ میں، ہمیشہ ناگزیر طور پر ضروری ہوتا ہے۔ ہر قسم کی ترقی اور کامیابی صبر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ صبر اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ناممکن کے پیچھے نہیں دوڑے گا، بلکہ ممکن کے دائرہ میں اپنی کوششیں صرف کرے گا۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ الاقدم فالاقدم کے اصول پر عمل کرے، وہ منصوبہ بند انداز میں اپنا تمام کام کرنے لگے۔

دور ملوکیت میں صبر کی اہمیت کی تفصیل "راہ عمل" کے متعلقہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں اس کی مزید تفصیلات درج ہیں۔

پونہ میں الرسالہ اور اسلامی مرکز کی کتابوں کے لیے
مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:

ISLAMIC BOOK CENTRE
1050 Raviwarpet PUNE 411 002 Phone: 448330

خبرنامہ اسلامی مرکز - ۵۵

۱۴ جولائی ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ تقریر کا عنوان تھا: قربانی کا تصور اور ہمارا معاشرہ۔ تقریر میں بتایا گیا تھا کہ قربانی کے عمل کا بہت گہرا تعلق انسانی زندگی کی تعمیر سے ہے۔ قربانی کا عمل اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو پورا انسانی معاشرہ صحت مند معاشرہ بن جائے۔

ایک صاحب سلطنت عمان سے لکھتے ہیں: میں ۱۹۸۴ سے الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ میں الرسالہ سے اس قدر مانوس ہوا ہوں کہ ہر ماہ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتا ہوں۔ میں خود الرسالہ پڑھتا ہوں اور پھر اس کو بلوچستان میں اپنے دوستوں کے لیے بھیج دیتا ہوں۔ عرب امارات میں میرے ایک رشتہ دار ہیں، اور ایک بحرین میں ہیں۔ ان سب کو بھی برابر الرسالہ بھیجتا ہوں۔ ہم سب کو یہ رسالہ بہت پسند ہے۔ آپ کی اعراض کی نصیحت پر میں خود عمل کرتا ہوں اور دوسروں سے کہتا ہوں۔ میں نے آپ کی کتاب خاتونِ اسلام بھی پڑھی۔ بہت اچھی ہے

ٹائمس آف انڈیا گروپ کی طرف سے ۶ ستمبر ۱۹۸۹ کو ایک سیمینار ہوا۔ اس کا موضوع آنکھ کا عطیہ اور مذہب (Eye donation and religion) تھا۔ صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالیں۔ اس کے مطابق صدر اسلامی مرکز نے نئی دہلی کے اس سیمینار میں شرکت کی اور "آنکھ کا عطیہ اور اسلام" کے موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ یہ مقالہ انشاء اللہ الرسالہ (انگریزی) میں شائع کر دیا جائے گا۔

ٹوکیو (جاپان) سے ایک اخبار نکلتا ہے جس کا نام سیکائی نپو (Sekai Nippo) ہے۔ اس اخبار کے ایک جاپانی رپورٹر کونیو نیشی (Kunio Nishi) ۶ اگست ۱۹۸۹ کو اسلامی مرکز میں آئے اور ہندستانی مسلمانوں کے مسائل پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ مسٹر کونیو نیشی انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھیں گاڈ ارائزز اور مرکز کے کچھ دوسرے انگریزی لٹریچر دیے گئے۔

ایک دعوت نامہ کے تحت صدر اسلامی مرکز نے راجستھان کا سفر کیا اور خطابات کیے۔ یہ سفر ۲۷ جولائی کو شروع ہوا اور یکم اگست ۱۹۸۹ کو ختم ہوا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

راجستھان کے سفر (جولائی ۱۹۸۹) میں وہاں کے مسلمانوں نے یہ کہا کہ ہماری ریاست ایک ہندی ریاست ہے۔ ہمارے بچے اب ہندی پڑھتے ہیں۔ ان کے لیے ہندی الرسالہ کی سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ انشاء اللہ الرسالہ کا ہندی اڈیشن بھی جاری کیا جائے گا فی الحال وہاں کے بعض مقام پر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ہفتہ میں ایک بار کسی مقام پر جمع ہوں۔ کوئی اردو داں نوجوان الرسالہ کا ایک دو صفحہ پڑھ کر سنائے اور قابل فہم زبان میں اس کی تشریح کرے۔ شیوگنج میں اس نوعیت کا پہلا افتتاحی اجتماع ۲۹ جولائی کو کیا گیا۔ یہ طریقہ دوسرے مقامات پر بھی اختیار کرنا چاہیے۔

ایک صاحب سلالہ (سلطنت عمان) سے لکھتے ہیں: اب ایسا ہوگیا ہے کہ زندگی کے معمولات کو برتنے سے بیشتر آپ کی تحریر راہ نمائی کا ذریعہ بننے لگی ہے۔ الرسالہ کا مطالعہ کرنے والا شخص کبھی غیر سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ الرسالہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ بجھے ہوئے دماغ کو نئی روشنی عطا کرتا ہے اور حالات کے ماروں کو غیر معمولی توانائی بخشتا ہے۔ میں آپ کی کتابوں کو عیسائی اور غیر مسلم برادری میں اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بنا رہا ہوں۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کو ابھی تک کوئی صالح مواد فراہم نہیں کیا گیا۔ آج مسلمانوں کا جو بھی اخبار یا رسالہ ہے، سب نفرت کی تبلیغ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ انشاء اللہ آپ کے پیغام اور الرسالہ کی دعوت کے ذریعہ یہ کام ہوسکے گا۔ (فطین اشرف صدیقی)

لئیق احمد خاں انجینیر نے بتایا کہ بنگلور میں مسیحی دکان دار ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے گاہکوں کو سامان کے ساتھ اپنے مذہب کی کتاب بطور گفٹ دیتے ہیں۔ وہاں حلقہ الرسالہ (عبداللہ برمی صاحب وغیرہ) نے یہ تحریک چلائی کہ مسلمان دکاندار اسلامی مرکز کی کتابیں اپنے گاہکوں کو گفٹ کے طور پر دیں۔ چنانچہ بہت سے دکاندار راضی ہوگیے۔ وہ جب کسی گاہک

کے ہاتھ اپنا سامان فروخت کرتے ہیں تو اس کو مرکز کی چھپی ہوئی کوئی انگریزی یا اردو کتاب بطور گفٹ (تحفہ) دیدیتے ہیں۔ یہ طریقہ دوسرے شہروں میں بھی کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔

۹۔ دہلی کے انٹلکچول فورم کی طرف سے ایک سمپوزیم ۲۸ جولائی ۱۹۸۹ کو ہوا۔ اس کی کارروائیاں ہماچل بھون (نئی دہلی) میں انجام پائیں۔ اس کا موضوع تھا: نیشنلزم اینڈ کمیونلزم۔ صدر اسلامی مرکز کو اس میں خطاب کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر ایک سفر کی وجہ سے وہ اس میں شرکت نہ کرسکے۔ تاہم منتظمین کو موضوع سے متعلق کچھ لٹریچر روانہ کردیا گیا۔ اس سمپوزیم کے کنوینر ڈاکٹر وجے کمار ملہوترا تھے۔

۱۰۔ شتم رسول کے مسئلہ پر ایک مفصل کتاب تیار ہوئی ہے۔ اس کی کتابت ۱۸۴ صفحہ پر مکمل ہوئی ہے۔ اس کا نام "رشدیات" ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی وہ چھپ کر شائع ہوجائے گی۔

۱۱۔ ایک قدیم اور مشہور دار العلوم (عربی درسگاہ) کے ایک طالب علم اپنے خط مورخہ ۴ جولائی میں لکھتے ہیں: یہاں دار العلوم میں ایک نیا سلسلہ چل نکلا ہے۔ وہ یہ کہ طلبہ مجھ سے الرسالہ لیتے ہیں اور اس کے مضامین کا عربی ترجمہ کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ الرسالہ کی زبان اتنی معیاری اور عام فہم ہوتی ہے کہ اس سے عربی ترجمہ کی بہت اچھی مشق کی جاسکتی ہے۔ میں نے عربی میں ترجمہ کرنا شروع کیا تو واقعی بہت زیادہ فائدہ محسوس ہوا۔ خصوصاً اس لیے کہ صرف ایک صفحہ کا مضمون ہوتا ہے، اس لیے تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ دوسرے دن نیا مضمون پھر سے نشاط پیدا کردیتا ہے۔ میرے بہت سے ساتھی الرسالہ کے قدیم نسخے میرے پاس سے لے جاکر عربی میں اور بعض طلبہ انگلش میں بھی ترجمہ کررہے ہیں۔ میں الحمد للہ روزانہ کم از کم الرسالہ کے ایک مضمون کا عربی اور انگریزی دونوں میں ترجمہ کررہا ہوں۔ دوسروں کے مضامین میں اتنی پیچیدگی ہوتی ہے کہ ترجمہ کرتے وقت بار بار جھنجھلاہٹ ہوتی ہے، لیکن الرسالہ کے مضامین کے ترجمہ میں ایک عجیب لطف محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو بات بھی اس میں ہوتی ہے وہ بالکل صاف سیدھے اور ٹھیک اسلوب میں ہوتی ہے۔ بے باک انداز تحریر اور دو دو چار کی طرح واضح بات ہوتی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

ISLAM

In Contemporary Language

AL-RISALA monthly has a two-fold aim: first, to introduce Islam as a divine message; second, to promote positive and constructive thinking among the people. It is published in Urdu and English by the Islamic Centre, New Delhi.

To receive your copies of this thought-provoking magazine regularly, subscribe NOW.

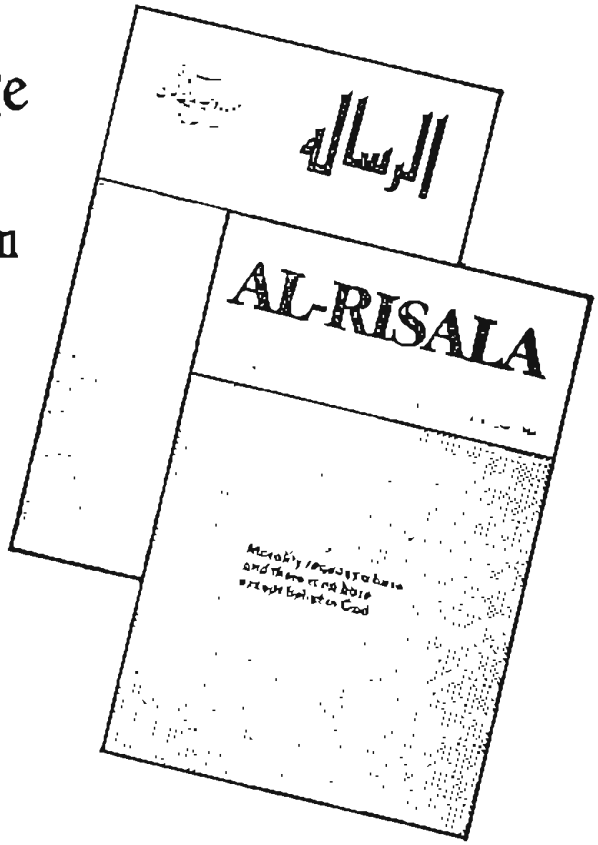

Ask for a free sample copy.

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: ______________________

Address: ______________________

____

____

Please send a free sample copy of AL-RISALA at the following address:

____

____

____

(Please use a separate sheet for more than one address)

☐ Please send a publications catalogue

Please tick box where applicable

☐ Urdu ☐ 1 year ☐ 3 years
☐ English ☐ 2 years ☐ 5 years
☐ Air-mail ☐ Surface-mail

I am enclosing Cheques/Bank Draft/ Postal Order/M.O. Receipt No. ________

Subscription Rates

INLAND	ABROAD AIRMAIL	ABROAD SURFACE MAIL
1 year Rs 60	Rs 400/$25/£15	Rs 200/$15/£8
2 years Rs 110	Rs 700/$45/£25	Rs 350/$25/£15
3 years Rs 150	Rs 1000/$65/£40	Rs 500/$35/£20
5 years Rs 240	Rs 1500/$100/£60	Rs 750/$55/£30

Pakistan Rs 150 for one year

Supporting Subscription (For One Year)

INLAND.......................................Rs 300
ABROAD (By Air-mail)..............................$100/£60

Please send this together with the payment to the Circulation Manager.

AL-RISALA, The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 September 1989 No 154

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
〃 〃 جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad	
The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad	
The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳